انوشا اور
سکندر اعظم

انوشا کی آپ بیتی

تیسرا حصّہ

انوشا اور سکندرِ اعظم

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

پہلی بار ۱۹۷۹

تعداد ۴۰۰۰

قیمت ۴-۰۰

فہرست

انوشا کی آپ بیتی

انوشا کی اس حیرت انگیز اور پُر اسرار آپ بیتی کا آغاز آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے اس وقت ہوتا ہے جب یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ (فیلقوس) کے بیٹے سکندر نے اپنے مُنہ زور سیاہ گھوڑے بیوسی فالس کی باگیں مشرق کی طرف پھیریں تھیں اور ایران کی عظیم سلطنت کو روندتا ہوا پنجاب تک آ پہنچا تھا۔ پھر تاریخ کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے یہ داستان تاریخ کے اُس نازک اور فیصلہ کُن لمحے پر ختم ہوتی ہے جب دریائے جہلم کے کنارے شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت موریہ نے سیلوکس کو شکست فاش دی تھی۔ عین اُس جگہ جہاں اِس سے پہلے سیلوکس کے آقا سکندر نے مہاراجا پورس

پر فتح پائی تھی۔

سکندر نے وادئ کابل فتح کرنے کے بعد، ۳۲۷ ق م میں وادئ سندھ کا رُخ کیا تھا جسے اُس زمانے میں سپت سِندھو یعنی سات دریاؤں کی سر زمین کہا جاتا تھا۔ سات دریاؤں کی یہ سر زمین چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی اور یہ ریاستیں اکثر آپس میں لڑتی بھڑتی رہتی تھیں۔

درّہ مالا کنڈ کے شمال میں اشواک قبیلے کی حکومت تھی جس کا صدر مقام مساگا تھا۔ پشکلاوتی میں (جس کے کھنڈر آج بھی چارسدہ کے قریب موجود ہیں) گندھرو قوم سے کنٹک قبیلے کا راج تھا۔ ہزارہ اور بھمبر کی پہاڑیوں میں راجا ابھی سار حکومت کرتا تھا۔

راجا ابھی سار کی ریاست کے جنوب میں ٹیکسلا کی ریاست تھی جو سندھ سے جہلم تک کے درمیانی علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی تھا۔ جہلم اور چناب کے درمیانی علاقے پر مہاراجا پورس کی حکومت تھی جو پورو خاندان سے

تعلّق رکھتا تھا۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی اس کا بہت بڑا مخالف تھا۔ چناب سے راوی تک کا علاقہ پورس کے ایک رشتے دار کے قبضے میں تھا۔

راوی کے پار کا تھی قبیلے کی حکومت تھی جس کا صدر مقام سانگلا تھا۔ یہ شہر امر تسر سے کُچھ اوپر گورداس پُور کے ضلع میں تھا۔ سندھ، جہلم، چناب اور راوی کے زیریں علاقوں میں مختلف قبیلوں کی حکومتیں تھیں، جن میں ملّہی، سیر ی، یادو اور کشودرک خاص طور پر اپنی شجاعت اور حوصلہ مندی کے لیے مشہور تھے۔ انوشا ٹیکسلا کے راجا امبھی کا بڑا بیٹا تھا۔ اُس نے ٹیکسلا کے راج محل میں آنکھ کھولنے کے باوجود ٹیکسلا سے دور اپنی ننھیال پشکلاوتی میں شیش ناگ کے سائے میں پرورش پائی تھی، کیوں کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اُس کی قسمت میں نہ تھا۔

انوشا کا بچپن ناگوں کے ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر، شہروں میں، بستیوں میں، راج محلوں میں، جنگلوں میں، وہ جہاں بھی گیا، اُس کا سامنا ناگوں سے ہوا۔ اُس کا ایک قدم انسانوں کی دُنیا میں تھا اور دوسرا ناگوں کی دُنیا میں۔

اکثر یہ دونوں دُنیائیں یوں گڈ مڈ ہو جاتیں تھیں کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انسانوں کی دنیا کون سی ہے اور ناگوں کی دنیا کون سی؟

اپنی زندگی کے پہلے دس سال اس نے پشکلاوتی میں گزارے اور پھر اپنی ماں کے مرنے پر وہ کشمیر کے ایک شہر پرور پُور کی طرف چل دیا۔ پرور پُور میں اُس کی بڑی خالہ رہتی تھی جس کا شوہر وہاں تکشک ناگ کے مندر کا پروہت تھا۔ کشمیر کی طرف جاتے ہوئے جب وہ ٹیکسلا سے گزرا تو اُسے خبر ملی کہ چند روز پہلے راجا امبھی اور راجا پورس کے درمیان ایک خوفناک لڑائی ہوئی۔ جس میں پورس نے امبھی کو بُری طرح شکست دی ہے۔ وہ اِس خبر پر کان دھرے بغیر آگے بڑھ گیا تھا اور اُسے گمان تک نہ تھا کہ ایک روز وہ تاریخ کے دھارے کے ساتھ ہوتا ہوا ٹیکسلا آئے گا۔ نہ صرف ٹیکسلا آئے گا بلکہ ٹیکسلا سے مگدھ کے دارالسلطنت پاٹلی پتر تک جائے گا۔ (مگدھ کی قدیم سلطنت اُس جگہ آباد تھی جہاں اب بھارت کا صوبہ بہار آباد ہے۔ بہار کے دارالحکومت پٹنہ کا پرانا نام پاٹلی پتر تھا۔)

انوشا اپنی خالہ کے پاس پہنچا تو اندھیر نگری کے دِل چسپ واقع کی بدولت اُس کی

ملاقات سارنگ باباسے ہوئی اور وہ اُن کے ساتھ ہولیا۔

سارنگ بابا کی بدولت انوشا کی زندگی میں ایسے حیرت انگیز واقعات پیش آئے جِن کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے ایک چودہ ہاتھ لمبے ناگ سے زندگی اور موت کی جنگ لڑی۔ ایک ایسا ناگ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا جسے ابھی انسان بننے کی طاقت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر سارنگ بابا اور انوشا نے ایک عورت کے پیٹ سے سانپ نکالا جو اُسے جونک کی طرح چمٹا اُس کا خُون چوس رہا تھا۔ یہ عورت سارنگ بابا کے ایک دوست سردار کی بیوی تھی۔ سردار نے اپنی بیوی کی بیماری دور ہونے کی خوشی میں ایک جشن کیا۔ اُس جشن میں طرح طرح کے کھیل تماشے ہوئے، اور پھر ایک سپیرا سارنگ بابا کے مُقابلے پر آیا۔ اُس مُقابلے کے نتیجے میں سارنگ بابا اور انوشا کو وہ سانپ ہاتھ آیا جو اپنی پھُنکار سے پتھّر کو ریزہ ریزہ کر دیتا تھا۔ صرف ہی نہیں اُس کی پھُنکار اپنے سامنے کی چیزوں کو خشک لکڑی کی طرح جلا ڈالتی تھی، خواہ وہ چیزیں جاندار ہوں یا بے جان۔ سارنگ بابا نے اُس کا نام شانی رکھا اور اُسے انوشا کا دودھ شریک بھائی بنا دیا۔

پھر ایک پہاڑی بستی کے قریب ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ثابت کر دیا کہ شانی واقعی انوشا کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ شانی کئی دِن کا بھوکا پیاسا تھا اور سارنگ بابا انوشا اور شانی کو ایک غار میں ٹھہرا کر دودھ لینے گئے ہوئے تھے کہ بارش اور آندھی آگئی اور ایک بھاری چٹان نے اوپر سے لُڑھک کر غار کا دروازہ بند کر دیا۔ اس پر شانی نے غار کے دروازے پر پڑی ہوئی چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور یُوں انوشا کو غار کی قید سے نجات دِلائی۔

پھر سارنگ بابا انوشا کو ساتھ لے کر ویری ناگ کے چشمے پر پہنچے۔ ویری ناگ میں انوشا نے سُنہری ناگ کو ایک خوفناک مُقابلے میں ہرانے کے بعد اس کا مَن حاصل کیا، جسے سارنگ بابا نے دُودھ میں حل کر کے انوشا کو پِلا دیا۔ اِس مَن کی بے پناہ طاقت کو اپنے جسم میں جذب کرنے کے لیے انوشا کو چالیس دِن کا فاقہ کرنا پڑا جس کے بعد سُنہری ناگ اُس کا دوست بن گیا۔

اس کے بعد دونوں شہر بھوگ متی کے راجا ناگ سین کے محل میں پہنچے۔ وہاں راجا ناگ سین کے جوگی بھائی کی لاش کے ساتھ انوشا کا مُقابلہ ہوا۔ انوشا نے اُس

مُقابلے میں جیت کر اس لاش کی زبان حاصل کی جو بتاشے کی طرح اُس کے مُنہ میں گھُل گئی۔

پھر وہ ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں ایک نوجوان کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور یہ سانپ اُس کے جسم سے چمٹا ہوا تھا۔ سارنگ بابا نے اُس سانپ کی جان کو اُس نوجوان کے جسم میں ڈال دیا اور اس سانپ کی راکھ احتیاط سے اپنے پاس رکھ لی۔ اِس کے بعد سانگ بابا اور انوشا کیسر ناگ کے جنگل کی طرف چل دیے۔

اس جنگل میں ان کا کیسر ناگ کے ساتھ خوفناک معرکہ ہوا، جو چودھویں رات کی چاندنی میں اپنے بھاری بھر کم اژدہے پر سوار ہو کر جنگل کی سیر کو نکلتا تھا۔ بڑی مُشکلوں کے بعد سارنگ بابا نے کیسر ناگ کو قابو میں کیا تو اس کا آدھا حصّہ خود کھا گئے اور آدھا حصّہ زبردستی انوشا کو کِھلا دیا۔ اِس کے ساتھ ہی انوشا پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

انوشا کو ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو اور سارنگ بابا کو اُس میدان میں پایا،

جہاں سے انہیں شانی ہاتھ آیا تھا۔ یہیں انہیں سفید اور سُرخ ہیرے ملے۔ سارنگ بابا کے کہنے کے مطابق سفید ہیرے تکشک ناگ اور سُرخ ہیرے شیش ناگ کی امانت تھے۔

انوشا سارنگ بابا کے ساتھ واپس پرور پُور پہنچا، سفید ہیرے تکشک ناگ کی نذر کیے اور پھر اپنی خالہ سے ملنے کے بعد سارنگ بابا کے ساتھ پرور پُور کے محل میں پہنچا، جہاں سارنگ بابا کا بھتیجا اور پرانا چیلا راموراجا رام بن کر راج کر رہا تھا۔ اس کی شادی سیال کوٹ کے راجا کی بیٹی رانی چندا سے ہو چُکی تھی پہلے ہی اُس نے ایک لڑکے رتن کو جنم دیا تھا۔ ان کی پیدائش پر راجا سیال کوٹ نے اپنی بیٹی کو چاندی کے شیر کا تحفہ دیا تھا۔ سارنگ بابا نے جوابی تحفہ دینے کے لیے ایک ہاتھی کو سونے کا بنا دیا۔

اس کے نتیجے میں سارنگ بابا اور انوشا سونے کے ہاتھی کے ساتھ ساتھ خود بھی سیال کوٹ پہنچے۔ وہاں اُنہوں نے رانی چندا کی چھوٹی بہن چمپا کو ایک سانپ کے پنجے سے نجات دِلائی۔ یہ سانپ اتّفاق سے وہی تھا جو ایک بار اُن کے ہاتھ سے

نکل گیا تھا۔ چمپا کی شادی راجا پورس کے چھوٹے بیٹے امر سے ہوئی تھی۔ امر اور چمپا کے ساتھ سارنگ بابا اور انوشا بھی سیال کوٹ سے مہاراجا پورس کے دربار میں پہنچ گئے۔

پورس کے دربار میں ایک جشن ہوا جس میں دربار کی نامور رقّاصہ اُوشا نے انوشا کی بِین کی دُھن پر اپنے ناچ کا کمال دکھایا۔ آدھی رات کے بعد اُوشا کے پالتو سانپ امبر نے پورس کے بڑے بیٹے کو ڈس لیا اور اُس کے ساتھ ہی اُوشا پُر اسرار طور پر دربار سے غائب ہو گئی۔

سارنگ بابا نے راج کُمار کا علاج کر کے اُسے ٹھیک کر دیا، مگر اُوشا کو پورس کے سپاہی کوئی مہینہ بھر تلاش کرتے رہے۔ آخر جب پورس نے سارنگ بابا سے درخواست کی تو سارنگ بابا کے کہنے پر انوشا پل بھر میں اُوشا کو ڈھونڈھ لایا۔ پورس کو یہ شک تھا کہ کہیں اُوشا نے یہ حرکت اُس کے پرانے دُشمن امبھی کے کہنے پر نہ کی ہو۔ لٰہذا اُس نے اُوشا کو اپنے دربار سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔

اُوشا نے پشکلاوتی جانے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ سارنگ بابا اور انوشا، اُوشا کو ساتھ لے کر پشکلاوتی جانے کے ارادے سے ٹیکسلا کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ انوشا کی آپ بیتی کے پہلے دو حصّوں کا خلاصہ ہے۔ اس سے آگے کی داستان آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

سارنگ بابا، اُوشا اور انوشا، پُشکلاوتی جانے کے ارادے سے ٹیکسلا کی طرف آئے تھے، مگر قدرت نے انھیں سکندر کے دربار میں پہنچا دیا اور یوں انوشا کی آپ بیتی کے اِس حصّے میں سکندر اور اُس کے حملے کی پوری داستان آ گئی ہے۔ یہ حیرت انگیز داستان اس سے پہلے اُردُو تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں بھی شائع نہیں ہوئی۔

سکندر کے مہمان

ٹیکسلا پہنچ کر ہم نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ میری خواہش تھی کہ ہم خاموشی کے ساتھ اِس سے گُزر جائیں۔ یہ وہی شہر تھا جہاں کا راجا میرا باپ تھا اور جس کے محل میں مَیں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ لیکن میں تو اُس کے لیے گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مر چُکا تھا۔ اِن باتوں کی یاد سے میرے دِل پر اس وقت بھی چوٹ لگی تھی جب میں اپنی ماں کے مرنے کے بعد کشمیر کی طرف جاتے ہوئے یہاں سے گُزرا تھا۔ اور اب میرے زخم پھر ہرے ہو گئے تھے۔

لیکن اُس وقت میں اکیلا تھا اور صورت شکل سے اچھا خاصا بھکاری معلوم ہوتا تھا،

اس لِیے میری طرف کسی نے توجّہ نہ کی تھی۔ لیکن اب تو میں اکیلا نہ تھا۔ میرے ساتھ سارنگ بابا تھے۔ میرے ساتھ شانی تھا۔ میرے ساتھ اُوشا تھی۔ اور اُوشا کا پالتو سانپ امبر تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حالات میں ایک ایسی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

اُس وقت جب میں کشمیر جاتے ہوئے ٹیکسلا سے گُزرا تھا تو مُجھے سرائے کے مسافروں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کُچھ روز پہلے راجا امبھی اور مہاراجا پورس کے درمیان ایک خوف ناک لڑائی ہوئی ہے، جس میں پورس نے امبھی کی فوجوں کا پلیتھن نکال کر رکھ دیا ہے۔ اور اب سرائے میں پہنچتے ہی مُجھے پہلی بات جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ یونان کی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فِلپ کا بیٹا سکندر مصر، ایران اور افغانستان کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان آ پہنچا ہے۔ راجا امبھی نے لڑائی کے بغیر سکندر کی اطاعت قبول کر لی ہے اور اب وہ ٹیکسلا میں راجا امبھی کا مہمان ہے۔

سکندر دریائے سندھ کو عبُور کر کے راجا امبھی کی ریاست میں داخل ہوا تھا تو

امبھی نے سات سو سواروں کا ایک دستہ اُس کے استقبال کے لیے بھیجا تھا۔ اور ریشمی جھُولوں والے تیس ہاتھی، چاندی کے توڑوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں اور بے شمار قیمتی تحفے سکندر کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ ایک خاص ہاتھی سکندر کی بیوی رُخسانہ کی سواری کے لیے بھیجا گیا تھا، جس کے ساتھ خواجہ سراؤں کی ایک جماعت بھی تھی۔ رُخسانہ کے لیے جو قیمتی لباس اور ہیرے جواہرات راجا امبھی نے بھجوائے تھے، انہیں پہن کر وہ ایک ایسا بُت نظر آتی تھی جسے سر سے پاؤں تک ہیرے جواہرات پہنا دیے گئے ہوں۔

ٹیکسلا پہنچنے پر سکندر کا جو استقبال ہوا، وہ دریائے سِندھ کے کنارے ہونے والے اِستقبال سے کئی گُنا شاندار تھا۔ اِس استقبال سے خوش ہو کر سکندر نے راجا امبھی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پورس کے خلاف جنگ میں امبھی کا پورا پورا ساتھ دے گا۔

سکندر کے سپاہی ٹیکسلا کے ارد گرد خیموں میں ٹھہرے ہوئے تھے، جن میں سے کئی سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہو گئے۔ سکندر کو معلوم ہو چکا تھا کہ اِس علاقے میں سانپوں کی کثرت ہے اور اُن میں سے خاص طور پر پھنیر سانپ ایسا ہے کہ

اُس کا ڈسا ہوا بچتا نہیں۔ اُس کے ایک کمانڈر نیارکس نے ایک ایسا چتکبرا سانپ دیکھا تھا جو سولہ ہاتھ لمبا تھا۔ اُس نے اُسے پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن وہ تیزی سے نکل گیا تھا۔

سکندر کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اِس علاقے میں سانپ کو مُقدّس سمجھا جاتا ہے اور یہاں کُچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سانپ کے کاٹے کا علاج کرتے ہیں۔ اس نے راجا امبھی کو ہدایت کر دی تھی کہ اُس کی ریاست میں جو لوگ بھی سانپ کے کاٹے کا علاج کرتے ہیں، انہیں اُس کے حضور پیش کیا جائے۔

راجا امبھی کے سپاہی گاؤں گاؤں، بستی بستی جا کہ تمام سپیروں، جوگیوں اور سنیاسیوں کو ٹیکسلا لے آئے تھے۔ اُن لوگوں کی تعداد کوئی پچاس کے قریب تھی۔ جب اُنہیں سکندر کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اُن کے ساتھ بڑی عزّت سے پیش آیا۔ اُس نے حکم دیا کہ اِن تمام لوگوں کو اُس کے لشکر کے قریب ایک خیمے میں ٹھہرایا جائے اور جسے بھی سانپ ڈس لے، اُس کا علاج اِن لوگوں سے کرایا جائے۔

سکندر نے یہ حکم بھی دیا کہ جہاں کہیں بھی کوئی ایسا شخص نظر آئے جو سانپ کے ڈسے کا یا کسی اور بیماری کا علاج کر سکتا ہو، اُسے فوراً اُس کے حضور پیش کیا جائے۔ ہم سپیرے بھی تھے اور جوگی بھی، اور سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے کے علاوہ بھی بہت کُچھ جانتے تھے۔ چنانچہ رات بسر کرنے کے بعد جب، ہم صُبح کے وقت آگے جانے کے ارادے سے سرائے کے باہر آئے تو دروازے پر راجا امبھی کے پیادوں نے ہمیں گھیر لیا اور ہمیں سکندر کے پاس لے گئے۔

میں نے اِس سے پہلے مہاراجا پورس کو دیکھا تھا، اور اب وہ سکندر میری نگاہوں کے سامنے تھا، جو یونان سے نِکل کر راستے کی تمام چھوٹی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا ٹیکسلا تک آ پہنچا تھا۔ یہ وہ سکندر تھا جس کی اطاعت راجا امبھی نے صرف اس لیے قبول کی تھی کہ اُس کی مدد سے اپنے پرانے دُشمن پورس کو نیچا دِکھا سکے۔

میں نے پورس کی آنکھیں دیکھی تھیں، جن میں عُقاب کی سی تیزی تھی۔ لیکن سکندر کی نیلی نیلی آنکھیں اپنے اندر کُچھ اور ہی اثر رکھتی تھیں۔ مُجھے یوں لگا جیسے

میں شیش ناگ کی آنکھیں دیکھ رہا ہوں۔

راجا امبھی، میرا باپ، سکندر کے پاس بیٹھا ہوا بالکل بے حیثیت معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اُس رُعب داب کا ہزارواں حصّہ بھی نہ تھا جو میں نے پورس کے چہرے پر دیکھا تھا۔ امبھی کے قریب ہی میرا وہ سوتیلا بھائی بیٹا تھا جو امبھی کی تیسری رانی سے تھا اور جس کے متعلّق نجومیوں نے یہ بتایا تھا کہ راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اِس لڑکے کی قسمت میں لکھا ہے۔ یہ وہ راج کُمار تھا جس کی خاطر میرا باپ مُجھے اور میری ماں کو بھول گیا تھا۔

میں نے راجا امبھی اور اُس کے قریب بیٹھے ہوئے راج کمار کو صرف ایک نظر دیکھا اور میری نگاہیں پھر سکندر کے چہرے پر جم گئیں۔ یہ اُس شخص کا چہرہ تھا جسے، آدھی دُنیا اپنا بادشاہ مان چکی تھی۔

آدھی دُنیا کا یہ بادشاہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور چند قدم چل کر سارنگ بابا کے سامنے آ کر رُک گیا۔

"تُم ہمیں اِن سپیروں سے مختلف نظر آتے ہو جو اب تک یہاں لائے گئے ہیں۔
تُم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

سارنگ بابا نے آداب بجالانے کے بعد کہا:

"ہم کشمیر سے آ رہے ہیں، میرا نام سارنگ۔ اور یہ میرے بچّے انوشا اور اُوشا ہیں۔" سارنگ، انوشا اور اُوشا کے نام سُن کر راجا امبھی اور اُس کے درباریوں میں کھُسر پھُسر ہونے لگی۔ سکندر نے اپنی گہری نیلی شیش ناگ کی سی آنکھوں سے ہم تینوں کو باری باری دیکھا، پھر کہنے لگا:

"سارنگ بابا! تمہیں دیکھ کر مُجھے اپنے استاد ارسطو کی یاد آتی ہے، جو عِلم کا سمندر اور عقل کا خزانہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی مُجھے یونان کا وہ بوڑھا فلسفی دیو جانس کلبی یاد آتا ہے جس کی نگاہوں میں دُنیا کی ساری شان و شرکت ہیچ تھی۔ اور تمہارے اس انوشا کر دیکھ کر میرا دھیان سورج دیوتا کی طرف جاتا ہے۔ اور رہی یہ لڑکی اُوشا۔۔۔"

”میں شیش ناگ کی بیٹی ہوں!“ اُوشا نے سکندر کو ٹوک کر کہا۔

اُوشا کی اِس جرأت پہ راجا امبھی اور اُس کے درباری حیران رہ گئے۔ انہیں یقین تھا کہ سکندر اِس حرکت پر غضب ناک ہو جائے گا، لیکن اُس نے قہقہہ لگایا اور کہا:

”شیش ناگ کی بیٹی! میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ تُجھے دیکھ کر میرا دھیان ناگوں اور ناگنوں کی اُن تصویروں کی طرف جاتا ہے جو مصر کے فرعونوں کے تاج پر بنی ہوئی ہیں۔ شیش ناگ کی بیٹی! تو ناچنا جانتی ہے؟“

اُوشا کسی قدر غصّے بھری آواز سے کہنے لگی ”آدھی دُنیا کا بادشاہ اُوشا سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا تو ناچنا جانتی ہے؟ کیا اُسے کسی نے نہیں بتایا کہ اُس کے سامنے وہ اُوشا کھڑی ہے جو مہاراجا پورس کے دربار کی نامور رقّاصہ رہی ہے۔“

اُوشا کے یہ الفاظ سُن کر دربار میں ایک سنّاٹا سا چھا گیا۔ سکندر کو اِس انداز سے مُخاطب کرنے کا کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ راجا امبھی اور اُس کے درباریوں

کو یقین تھا کہ اب کے سکندر واقعی غصّے میں آ جائے گا، لیکن اُن کی توقّع کے خلاف سکندر نے مُسکراتے ہوئے، بڑے اطمینان سے کہا:

"شیش ناگ کی بیٹی! مُجھے سچ مُچ اب تک کسی نے نہیں بتایا کہ تُو پورس کے دربار کی رقّاصہ رہی ہے۔ یہ تو بہت اچھّی بات ہے۔ ہم یہاں کھیل تماشوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔ اس میں تُو بھی اپنے جوہر دِکھانا۔"

اُوشا ابھی کُچھ کہہ نہ پائی تھی کہ راجا امبھی اُٹھ کر سکندر کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"مہاراج! ذرا جانچ پڑتال کر لیں تو اچھّا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پورس نے اِس کو جاسوسی کے لیے بھیجا ہو۔"

"امبھی کے یہ الفاظ سُن کر اُوشا ایک چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح تلملا اُٹھی اور بولی:

"مہاراج! وہ اور ہوں گے جو ایسی اوچھی حرکتیں کرتے ہیں۔ پورس مہاراج اس مٹّی کا مان اور اِس دھرتی کی لاج ہیں۔ نہ اُنہوں نے مجُھے جاسوسی کے لیے بھیجا

ہے، اور نہ میں جاسوسی کے لیے یہاں آئی ہوں۔ میں تو انوشا اور سارنگ بابا کے ساتھ شیش ناگ کے مندر کو جا رہی تھی کہ سپاہی ہمیں پکڑ کر یہاں لے آئے۔"

اُوشا کی جرأت اور دلیری حیران کر دینے والی تھی۔ وہ راجا امبھی پر بھی چوٹ کر گئی تھی۔ لیکن پورس کو نیچا دِکھانے کی خاطر سکندر کی اطاعت کرنے والا امبھی اِس چوٹ کو خاموشی سے برداشت کر گیا، صرف اس وجہ سے کہ سکندر نے اُس پر کوئی غصّہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ اُس نے اُوشا کی بات سُن کر اسی طرح مُسکراتے ہوئے کہا: "تین چار روز بعد کھیل تماشے ہونے والے ہیں۔ تُم اُس میں شامل ہو گی اور اپنے جوہر دِکھاؤ گی اور ہو سکتا ہے کوئی انعام بھی حاصل کر لو۔ اِس کے بعد تُم شیش ناگ کے مندر جا سکتی ہو۔"

اور پھر سکندر راجا امبھی سے مخاطب ہوا۔ "میرے دوست، یہ تینوں میرے مہمان ہیں۔ اِنہیں نہایت عزّت اور احترام سے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے۔"

راجا ابھی کی مُشکل

آن کی آن میں سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ کشمیر سے آنے والے جوگیوں کو سکندر کے حکم سے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ خبر جب اُن سپیروں تک پہنچ جنہیں سکندر کے لشکر کے قریب ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا تھا، تو وہ شاہی مہمان خانے کی طرف بھاگے آئے کہ دیکھیں تو سہی وہ کون سپیرے ہیں جنہیں سکندر نے ایسی عزّت کا حق دار سمجھا ہے۔

اُن میں سے کئی سپیرے سارنگ بابا کے پُرانے واقف تھے اور کئی ایک کو اُن واقعات کا عِلم بھی تھا جو ہمیں پرور پُور، ویری ناگ، کیسر ناگ کے جنگل اور

دوسری بستیوں میں پیش آئے تھے۔ اور ایک سپیرا تو اُن میں ایسا بھی تھا جس نے راجاناگ سین کے شہر بھوگ متی میں میری اور راجاناگ سین کے بھائی کی لاش کی عجیب و غریب لڑائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اُنہوں نے سارنگ بابا کے پاؤں چھُونے کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھوں کو بھی عزّت اور عقیدت سے بوسہ دیا۔ رہی اُوشا تو وہ عورت ہونے کے ناتے ویسے ہی اُن کی نظروں میں عزّت اور احترام کے قابل تھی۔

وہ سب کے سب ایک نصف دائرے کی شکل میں ہمارے سامنے بیٹھ گئے اور سارنگ بابا سے باتیں کرنے لگے۔ اُن باتوں میں میرا یا اُوشا کا کوئی حصّہ نہ تھا۔

سپیروں کی اِن باتوں کے دوران میں نے یوں محسوس کیا جیسے ایک بوڑھا سپیرا میرے گلے میں جھُولتے ہوئے شانی کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ جب بھی میری نگاہیں اُس کی طرف اُٹھتیں، میں یہی دیکھا کہ اُس کی نظریں شانی پر ہیں، لیکن میں نے اِس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔

سارنگ بابا اور سپیروں کی یہ محفل سہ پہر تک جمی رہی اور جب وہ رُخصت ہوئے تو بڑے خُوش نظر آتے تھے۔ شاید اِس لیے کہ سارنگ بابا کی صورت میں اُنھیں ایک ایسا ساتھی مل گیا تھا جس کو خود سکندر نے عزّت افزائی کے قابل سمجھا تھا، اور وہ ایسا ساتھی تھا جو آڑے وقت میں اُن کے کام بھی آ سکتا تھا۔

ہمارے نام اور کام کا چرچا ہونے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ سپیروں نے واپس جا کر پوری کر دی۔ اُوشا کے متعلّق تو دربار ہی میں سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ پورس کے دربار کی سب سے نامور رقّاصہ رہی ہے لیکن اب ہمارے متعلّق بھی راجا امبھی کو پتا چل گیا تھا۔ کہ سارنگ بابا اور انوشا ایسے پہنچے ہوئے جوگی ہیں کہ اُنھوں نے پرور پُور کے راجا رام کی رانی چندا کے کہنے پر ایک ہاتھی کو سونے کا بنا دیا تھا اور ایک مُردہ نوجوان کے جسم میں سانپ کی روح ڈال کر اُسے زندہ کر دیا تھا۔

رات کے وقت راجا امبھی خود شاہی مہمان خانے میں آیا۔ سارنگ بابا فرش پر پاؤں پسارے ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں شانی کو دُودھ پلا رہا تھا۔

اُوشا اپنے پالتو سانپ امبر کو دُودھ پلا رہی تھی۔ راجا ابھی دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سارنگ بابا سے مخاطب ہوا۔ ”سارنگ مہاراج! میں کُچھ عرض کرنے آیا ہوں۔“

سارنگ بابا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ہمارے بیٹے سے بات کرو۔“

ابھی دو قدم اور آگے بڑھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور اِسی طرح ہاتھ جوڑے ہوئے کہنے لگا۔ ”انوشا مہاراج! میں کُچھ عرض کرنے آیا ہوں۔“

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے سامنے میرا باپ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور مُجھے بیٹا نہیں، مہاراج کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں نجومیوں کی پیش گوئی کے الفاظ گونجنے لگے۔

”مبارک ہو مہاراج! راج کُمار قسمت کے بڑے ہی دھنی ہیں۔ بڑے بڑے راجا اُن کے آگے سر جھکائیں گے اور بڑے بڑے بہادر اُن کے آگے کان پکڑیں گئے

اور ماتھا رگڑیں گے۔"

شاید یہی وہ دِن تھا جس کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی۔ راجا امبھی کو نجومیوں کی پیش گوئی پر پورا پورا یقین تھا، تبھی تو اُس نے ماں بیٹے کو محل میں واپس بُلانے سے اِس لیے اِنکار کر دیا تھا کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج پاٹ سنبھالنا راج کُمار کی قسمت میں نہیں تھا۔ لیکن یہ بات کبھی راجا امبھی کے وہم و گمان میں بھی نہیں کی ہے کہ اس راج کُمار کے آگے سر جھکانے والے بڑے بڑے راجاؤں میں وہ خود بھی شامل ہو گا۔

"انوشا مہاراج! میں کُچھ عرض کرنے آیا ہوں۔" راجا امبھی نے دوبارہ کہا اور میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔

اپنے باپ کو اِس حالت میں دیکھ کر میرا دِل اور دماغ بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے بَل کھاتے ہوئے شانی کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں راجا امبھی کے عین سامنے کھڑا تھا اور میری نظر اُس کے چہرے پر

تھیں۔ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے میرے ذہن کے پردے پر اپنی ماں کی تصویر اُبھری اور پھر میرے دِل و دماغ میں آگ سی لگ گئی۔

”کیا راجا یہ پوچھنے آیا ہے کہ اُس کا وہ بڑا بیٹا کہاں ہے جو اُس کی بڑی رانی سے تھا؟ اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اُس کے لیے مر چُکا ہے۔ اب اگر اُس کے سامنے کبھی آیا بھی تو اِس حالت میں ہو گا کہ نہ بیٹا باپ کو باپ کہہ سکے گا اور نہ باپ بیٹے کو بیٹا کہہ کر بُلا سکے گا۔ پر نہیں۔ راجا تو شاید یہ پُوچھنے آیا ہے کہ پورس کے پاس کتنے ہاتھی، کتنے گھوڑے اور کتنے رَتھ ہیں۔ اُسے جان لینا چاہیے کہ بڑائی کا نشان ہاتھی گھوڑے اور رَتھ نہیں ہوا کرتے۔ بڑا وہی ہے جس کا دِل بڑا ہے۔ اور اُسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ طاقت وہی ہے جو اپنے بازوؤں میں ہو۔ پر نہیں نہیں۔ راجا تو شاید یہ پوچھنے آیا ہے کہ اپنے بھائی کو نیچا دکھانے کے لیے غیر کو اپنا آقا اور سردار مان لینے کے علاوہ اُسے اور کیا کُچھ کرنا چاہیے۔ اسے جان لینا چاہیے کہ اسے صرف ایک کام اور کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ چُلّو بھر۔۔۔۔۔“

”انوشا! ہوش میں آؤ۔ تُم اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہو۔“

یکایک ایک آواز میرے کانوں میں گونجی۔ یہ میری ماں کی آواز تھی۔ میں یوں چونکا جیسے ایک گہرے خواب سے جاگا ہوں۔ میں نے حیرانی سے اپنے اِرد گرد دیکھا۔ سارنگ بابا بدستور پاؤں پسارے اور ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اُوشا اپنے پالتو سانپ امبر سے کھیل رہی تھی۔ شانی میرے ہاتھ میں تھا۔ میرے سامنے راجا امبھی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی تھیں اور میرے ہونٹ یوں سختی سے بھنچے ہوئے تھے، جیسے سِی دیے گئے ہوں۔

راجا امبھی کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اُس سے کُچھ کہا ہے۔ شاید وہ تمام باتیں میں نے خیال ہی خیال میں راجا امبھی سے کہی تھیں۔

شاید میری ماں کی بے چین روح یہاں میرے ساتھ تھی۔ شاید اُسی نے میرے ہونٹ سِی دیے تھے۔ اُسی نے مُجھے ٹوکا اور ڈانٹا تھا۔

"انوشا مہاراج!" راجا امبھی کی آواز پھر اُبھری۔ "میں کُچھ عرض کرنے آیا ہوں۔"

اب کے راجا امبھی کے لہجے میں پہلے سے کہیں زیادہ لجاجت تھی۔ میں نے کُچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ ماں کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجی:

"انوشا! تُم اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہو۔"

میں نے جھُک کر راجا امبھی کو آداب کیا اور کہا:

"میں آپ کا بیٹا ہوں، مہاراج! فرمائیے کیا حکم ہے؟"

راج امبھی نے ذرا دیر خاموشی اختیار کی، پھر کہنے لگا۔ "میں یہاں سوالی بن کر آیا ہوں۔ ہم راجاؤں کی دنیا بڑی عجیب ہے۔ اپنی رعایا پر حکم چلاتے ہیں۔ اُن کا مال، اُن کی زندگیاں، سب ہمارے قبضے میں ہوتی ہیں۔ جنگل اور کھیت، سونا اور چاندی، ہاتھی اور گھوڑے سب کُچھ ہمارے بس میں ہوتا ہے، لیکن اِس کے باوجود کبھی کبھی ایسی مُشکل میں پھنس جاتے ہیں کہ سونا چاندی، ہاتھی گھوڑے اور مال و دولت سے ہماری مُشکل آسان نہیں ہو سکتی۔ ایسے میں ہمیں آپ جیسے جوگیوں کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ آپ کے دروازے پر سوالی بن کر آنا پڑتا

ہے۔“

راجا امبھی ذرا دیر کو رُکا اور پھر کہنے لگا:

”مہاراج! میری یہ مُشکل پورس کے خلاف سکندر کی حمایت حاصل کرنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ میرا اور پورس کا کبھی برابر کا جوڑ نہیں رہا۔ میری فوج کبھی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں رہی، جب کہ پورس کے پاس دو سو ہاتھی، چار ہزار گھوڑے اور دو سو رَتھوں کے علاوہ تیس ہزار پیادہ سپاہی ہیں۔ میں نے سکندر کو دوستی کا پیغام اُس وقت بھیجا تھا جب وہ کابل کی وادی کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے راجا ششی گپت کے ساتھ کابل میں جشن منا رہا تھا۔ پھر جب وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے میری سلطنت کی حد میں داخل ہوا تو میں نے ریشمی جھولوں والے تیس ہاتھی، چاندی کے توڑوں سے لدی ہوئی کئی بیل گاڑیاں اور بے شمار قیمتی تحفے اُس کی اور اُس کے افسروں کی نذر کیے تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ میں نے اپنی پوری سلطنت چاندی کی طشتری میں رکھ کر سکندر کو پیش کر دی تھی۔“

راجا امبھی نے اتنا کُچھ کہہ کر ذرا دم کیا اور پھر بات شروع کی:

”مہاراج! میں نے یہ سب کُچھ اِس لیے کیا تھا کہ پورس کے مُقابلے میں سکندر کی حمایت حاصل کر سکوں۔ ہم راجاؤں کی اپنی مُصیبتیں اور اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں بھائی بھائی کا بیری ہوتا ہے۔ یہاں اپنی گردن بچانے کے لیے بھائی کا گلا کاٹنا پڑتا ہے۔ یہاں بیٹا باپ کو قتل کر کے اُس کی کُرسی سنبھالتا ہے۔ میں نے بھی اپنے اور اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے سکندر کا سہارا لیا ہے اور یہیں سے میری مُشکل پیدا ہوئی ہے۔“

”وہ کیا مُشکل ہے، مہاراج؟“ یہ سارنگ بابا کی آواز تھی۔

”وہ مُشکل یہ ہے، مہاراج۔“ راجا امبھی نے سارنگ بابا کے بجائے مُجھے ہی مخاطب کیا۔ ”میں نے سکندر کو جس قدر چاندی دی تھی اس سے کہیں زیادہ دونا مجھے دے دیا ہے۔ اس نے میرے ساتھ ایک برابر کے بادشاہ کا سلوک کیا ہے۔ اس کے اپنی فوج کو حکم دے رکھا ہے کہ میرے علاقے میں لُوٹ مار بالکل نہ کی

جائے۔ اس کے فوجی شکایت کرتے ہیں کہ سکندر نے اس سے پہلے مشرق کے کسی حاکم، کسی بادشاہ، کسی راجا کو یہ عزّت نہیں دی۔ سچّی بات یہ ہے کہ سکندر مجھے اپنا دوست بنا کر بے حد خوش ہوا ہے۔ اسی دوستی کی خوشی میں اُس نے کھیل تماشوں کا انتظام کیا ہے۔ اور مہاراج! میری مُشکل یہ ہے کہ میں سکندر کو ان کھیل تماشوں کے موقع پر کوئی تحفہ نذر کرنا چاہتا ہوں۔ سونا، چاندی، ریشم، کمخواب اور ہیرے جواہرات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیّت نہیں۔ میں اُسے کوئی ایسا تحفہ دینا چاہتا ہوں جو نایاب ہو۔ ایسا تُحفہ جو بے مثال ہو۔ مہاراج! آپ نے رانی چندا کے لیے سونے کا ہاتھی بنا کر اس کی مُشکل آسان کی تھی، میری بھی مُشکل آسان فرمائیں۔"

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس بات کا کیا جواب دُوں کہ سارنگ بابا کہ آواز آئی:

"اطمینان رکھیں مہاراج۔ آپ کی مُشکل آسان ہو جائے گی۔"

شیش ناگ کا بیٹا

مہاراجا پورس اور راجا امبھی کی دنیا سے بہت دُور، مشرق کی طرف، دریائے گنگا کی وادی میں شیش ناگ راجاؤں کی ریاست مگدھ تھی۔ شیش ناگ، ساکادرن، کشیمادھر من اور کشتری اس خاندان کے پہلے چار راجا تھے۔ لیکن اُس کا پانچواں راجا بمبی سار وہ دلیر اور حوصلہ مند حکمران تھا جس نے شیش ناگ خاندان کی اِس معمولی سی ریاست کو ایک وسیع اور طاقتور سلطنت بنا دیا۔ اُسی کے زمانے میں جین مت کے بانی وردھان مہاویر اور بُدھ مت کے بانی مہاتما گوتم بُدھ نے اپنے مذہب کا پرچار شروع کیا۔

مگدھ کے مشرق میں انگہ، بنگہ، پنڈورا اور سوہما کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ شمال میں لچھوی خاندان کی ریاست ویسالی تھی۔ مغرب میں کوشل کی ریاست تھی اور جنوب میں کوسمبی اور آونتی دو ریاستیں تھیں، جو مگدھ سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقت ور تھیں۔ جب بمبی سار تخت پر بیٹھا تو کوسمبی پر پانڈو خاندان کا راجا اودے یان حکومت کر رہا تھا، جو آونتی کے راجا چندر امہا سین کا داماد بھی تھا۔

بمبی سار نے سب سے پہلے کوشل کے راجا کی بیٹی شادی کر کے کاشی کا علاقہ جہیز میں حاصل کیا۔ جب اُسے اس طرح اپنی ریاست کی مغربی سرحدوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اُس نے مشرق کی طرف توجّہ کی اور انگہ، بنگہ پنڈورا اور سوہما کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ اِس کے بعد اُس نے ایک اور شادی ریاست ویسالی کے لچھوی خاندان کے راجا کی بیٹی سے کی اور اِس طرح اپنی شمالی سرحدوں کو بھی محفوظ کر لیا۔

بمبی سار نے کوئی پچاس سال مگدھ کے تخت پر حکومت کی۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا اجاتاشترو مگدھ کی گدی پر بیٹھا اور اُس نے بھی مگدھ کی سرحدوں کو بڑھانے

کا سِلسِلہ جاری رکھا۔ سب سے پہلے اُس نے شمالی ریاست دیسالی پر حملہ کیا اور اُسے فتح کر کے مگدھ میں شامل کر لیا۔ اس کے کُچھ عرصہ بعد جب کوشل کے طاقت ور حکم ران راجا پراسین اجیت نے وفات پائی اجاتاشترو نے کوشل پر حملہ کیا اور کئی خونریز لڑائیوں کے بعد اُسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

ویسالی اور کوشل کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے اجاتاشترو نے کوسمبی پر حملے کی تیّاریاں شروع کریں۔ جاتاشترو نے ابھی ریاست کوسمبی کے چند علاقوں پر ہی قبضہ کیا تھا کہ ریاست آونتی کا راجا چندامہاسین کوسمبی کے راجا اودے یان، جو اُس کا داماد بھی تھا، کو بچانے کے لیے میدان میں آ گیا اور ایک بھاری فوج لے کر خود مگدھ کی طرف بڑھا۔ اجاتاشترو اگرچہ ویسالی اور کوشل کو فتح کر چُکا تھا لیکن وہاں کے لوگ دِل سے اُس کی اِطاعت پر راضی نہ تھے۔ اب جو آونتی کے راجا نے مگدھ کی طرف چڑھائی کی تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں آونتی، کوسمبی، کوشل اور ویسالی مگدھ کے خلاف اکٹھے نہ ہو جائیں۔

اجاتاشترو نے حملے کا خیال چھوڑ کر، مگدھ کی حفاظت کی طرف توجّہ کی اور دریائے

گنگا کے جنوبی کنارے پر بیسالی کی طرف سے حملے کو روکنے کے لیے پاٹلی پُتر پر مضبوط قلعہ بنایا اور اُس کے ساتھ ہی مُقابلے کے لیے تیّاریاں بھی جاری رکھیں۔ ابھی یہ تیّاریاں جاری تھیں کہ اجاناشترو نے وفات پائی اور اُس کی جگہ اس کا بیٹا دراشک گدّی پر بیٹھا۔ دراشک نے اپنی بہن پدماوتی کی شادی کوسمبی کے راجا اودے یان کے ساتھ کر کے صُلح کر لی اور اجاتاشترو نے کوسمبی کے جِن علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، وہ بھی واپس کر دیے اور اِس طرح جنگ کے وہ بادل جو اِن ریاستوں کی فضا پر چھا گئے تھے تِتّر بِتّر ہو گئے۔

اس کے بعد دراشک یا شیش ناگ خاندان کے کسی راجا نے اپنے کسی پڑوس کے راجا سے لڑائی مول نہیں لی۔ لیکن اب مگدھ کی ریاست ایک ایسی طاقت ور سلطنت بن چکی تھی، جس کا آس پاس کی ریاستوں میں کوئی ثانی نہ تھا۔

شیش ناگ راجاؤں نے مگدھ پر تین سو ساٹھ سال تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ مہانند اِس خاندان کا آخری راجا تھا، جِسے ایک شخص مہاپدم نند نے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا اور اِس طرح نند خاندان کی بنیاد ڈالی۔

مہا پدم نند نیچ ذات کا تھا، اِس لیے اِرد گرد کے تمام راجاؤں نے اُس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن مہا پدم نند، نیچ ذات سے تعلّق رکھنے کے باوجود، ایک اعلیٰ درجے کا حکمران ثابت ہوا۔ اُس نے کوسمبی، آونتی اور دیگر ریاستوں کی فوجوں کو شکستِ فاش دی اور اِن تمام ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اِس طرح مگدھ کی حدیں جنوب میں دریائے نربدا اور مغرب میں دریائے ستلج تک وسیع ہو گئیں۔

مہا پدم نند کے بعد اِس خاندان کے کئی راجا مگدھ کے تخت پر بیٹھے۔ جب راجا سُدھانند راجا بنا تو اُس نے پہلا حکم یہ جاری کیا کہ وہ تمام مرد موت کے گھاٹ اُتار دیے جائیں جِن کا تعلّق شِیش ناگ خاندان سے ہے۔ لیکن قسمت کی بات کہ شیش ناگ خاندان کا ایک فرد اِس ظُلم کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ اُس کا نام چندر گُپت تھا، اور جب سدھانند نے اپنا یہ ظالمانہ حکم جاری کیا تو وہ کم عُمر تھا۔ اُس کی دائی نے، جِس کا نام مورا تھا، اپنے بچّے کی قربانی دے کر اُسے بچ نکلنے میں مدد دی اور وہ چھُپتا چھُپاتا مگدھ کی حدود سے بھاگ کر ستلج کے پار پہنچ گیا۔ چندر گُپت بے

سر و سانی کی حالت میں جگہ جگہ چھُپا تا پھر تا تھا کہ اُس نے سکندر کے متعلّق سُنا کہ ٹیکسلا کے راجا امبھی کو اُس نے اپنا دوست بنا لیا اور اُس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ پورس کے ساتھ لڑائی میں اُس کا ساتھ دے گا۔ اِس سے چندر گُپت کے دِل میں اُمّید کی ایک کِرن پیدا ہوئی اور وہ ٹیکسلا چلا آیا۔ اب وہ سکندر سے ملاقات کرنا چاہتا تھا تا کہ نند خاندان کے ظالم راجا سدھا نند کے بارے میں بتائے اور اپنے کھوئے ہوئے تخت کو حاصل کرنے کے لیے سکندر کی امداد حاصل کر سکے۔

وہ کئی دِنوں سے ٹیکسلا میں تھا اور برابر اِس گھات میں لگا ہوا تھا کہ سکندر سے ملاقات کر سکے، لیکن اب تک اِس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہنے کو ایک راج کُمار تھا، لیکن اُس کی حالت دیکھ کر کون اُس کا یقین کر سکتا تھا۔ تُحفے تحائف بادشاہوں تک پہنچنے سب سے آسان ذریعہ ہوتے ہیں، لیکن وہ تو خود کوڑی کوڑی کا محتاج تھا۔ سکندر کے لیے، راجا امبھی کے لیے یا اُس کے کسی درباری کے لیے کوئی تحفہ کہاں سے لاتا۔

پھر اُس نے سُنا کہ کشمیر سے آئے ہوئے جوگیوں کو سکندر نے اپنے خاص حکم سے

شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا ہے تو وہ اُن جوگیوں سے ملنے چلا آیا کہ شاید اِسی طرح سکندر تک پہنچنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

چندر گُپت کی عُمر مُشکل سے اٹھّارہ سال ہو گی، لیکن اُس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جو بڑے بوڑھوں کے چہروں پر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ سارنگ بابا کو اپنی داستان سُنا رہا تھا اور میں حیرانی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پاٹلی پُتر سے لے کر ٹیکسلا تک اُس نے جو جو تکلیفیں اور مُصیبتیں اُٹھائی تھیں، وہ سب اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

سارنگ بابا کو اپنی داستان سُناتے ہوئے وہ بار بار میری اور اُوشا کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جب تک وہ اپنی کہانی کہتا رہا، میں، اُوشا اور سارنگ بابا خاموش رہے۔ جب وہ خاموش ہوا تو سارنگ بابا کہنے لگے:

"شیش ناگ کے بیٹے! ہم کسی نہ کسی طرح تُجھے سکندر سے ضرور مِلوا دیں گے،

لیکن تُجھے اِس سے کُچھ حاصل نہ ہو گا۔ راجا یا تو راجاؤں کی بات پر کان دھرتے ہیں یا اپنے افسروں کی بات سُنتے ہیں اور اِس وقت تُو نہ راجا ہے اور نہ افسر۔"

"میں جانتا ہوں، مہاراج! میں اِس وقت کُچھ بھی نہیں ہوں لیکن مُجھے اپنی زبان پر، اپنے دِل پر، اپنے دماغ پر اور اپنے بازوؤں پر بھروسا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کہاں زبان سے اور کہاں ہاتھ سے کام لینا چاہیے۔ آپ مُجھے سکندر سے مِلوا دیجیے، اور باقی سب کُچھ مُجھ پر چھوڑ دیجیے۔ یہ سوچنا میرا کام ہے کہ سکندر سے ملنے کے بعد مُجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔"

"اِس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"بڑی مہربانی، مہاراج۔"

یہ کہہ کے چندر گُپت ہمارے چہروں کا جائزہ لینے لگا اور پھر مارے حیرت کے چیخ اُٹھا:

"مہاراج! اِن دونوں کے چہرے بول رہے ہیں۔ مُجھے اپنے ہی خون کی بُو آ رہی

ہے۔ اپنے ہی خون کی بُو آرہی ہے۔"

سارنگ بابا مُسکرا دیے اور کہنے لگے۔ "شِیش ناگ کے بیٹے کو شِیش ناگ خاندان کے خُون کی بُو نہیں آئے گی تو اور کیسے آئے گی۔ انوشا کی ماں شیش ناگ خاندان سے تھی اور اُوشا۔۔۔۔"

"میں شِیش ناگ کی بیٹی ہوں۔" اُوشا نے تیزی سے کہا۔

اُوشا کے لہجے میں ایسی تیزی تھی کہ چندر گُپت چونک گیا۔

سارنگ بابا کہنے لگے۔ "ہاں، اُوشا پشکلاوتی کے شیش ناگ کی بیٹی ہے۔"

"اور میں پاٹلی پُتر کے شیش ناگ کا بیٹا ہوں۔" چندر گُپت نے کہا۔

پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اُوشا کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا "اُوشا! تُم میری بہن ہو اور میں تمہارا بھائی۔ کیا میں اُمّید رکھوں کہ کبھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو تُم میری، اپنے بھائی کی مدد کرو

گی؟“

اُوشا نے چندر گُپت کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور کہا۔ ”میں شیش ناگ کی قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں کہ وقت آنے پر اپنے بھائی کی پوری پوری مدد کروں گی۔ اپنی جان دے کر بھی کروں گی۔“

چندر گُپت نے اُوشا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر اُس کے ہاتھ چھوڑ کر میری طرف متوجّہ ہوا لیکن وہ ایک قدم آگے بڑھ کر میرے سامنے آنے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھر جھُک کر آداب بجالاتے ہوئے کہنے لگا:

”انوشا مہاراج! میں آپ کا ہم عُمر ضرور ہوں اور میری رگوں میں شیش ناگ خاندان کا خُون بھی ہے، لیکن آپ وہ ہستی ہیں جسے امبھی نے بھی مہاراج کہہ کر پکارا ہے۔ میں اِس حیثیت میں نہیں ہوں کہ اُوشا کی طرح آپ سے کوئی قول لے سکوں، لیکن مجُھے اطمینان ہے، پُورا پُورا اطمینان ہے کہ جب بھی کوئی آڑا وقت آیا، آپ میری مدد کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔“

دوسرے ہی روز سارنگ بابا نے چندر گُپت کو راجا امبھی کے ذریعے سکندر کے پاس پہنچا دیا۔ یہ مُلاقات امبھی کے دربار میں نہیں، ٹیکسلا کے باہر اُس جگہ ہوئی جہاں سکندر کی فوجیں خیموں میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ امبھی نے چندر گُپت کی سکندر سے ملاقات کروا دینے کا وعدہ تو کر لیا تھا، لیکن یہ وعدہ پورا کرتے ہوئے اُس نے عقل مندی سے کام لے کر ایسا بندوبست کیا تھا کہ اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ جائے تو اُس پر کسی قسم کا الزام نہ آئے۔

سکندر اُن ہاتھیوں کے معائنے کے لیے گیا ہوا تھا جو اُس کی ہدایت کے مطابق سدھائے جا رہے تھے۔ وہ اُن سُنہری جھُولوں والے تیس ہاتھیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا جو راجا امبھی نے اُسے تُحفے میں دیے تھے۔ اُس نے ہاتھیوں کو رقص کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اُن میں ایک ہاتھی ایسا تھا جس کی دونوں اگلی ٹانگوں پر جھانجھ بندے تھے۔ وہ ایک جھانجھ سونڈ سے پکڑ کر بجاتا اور دوسرے ہاتھی اُس کی تال پر ٹانگیں اُٹھا کر رقص کرتے۔

اِن ہاتھیوں کو دیکھ کر سکندر کو خیال آیا کہ ہاتھیوں کا شکار کرنا چاہیے۔ وہ یونانی

افسروں کو لے کر مقامی لوگوں کی رہنمائی میں شکار کے لیے نِکلا اور ہاتھیوں کے ایک گلّے پر جا پڑا اور تمام ہاتھیوں کو رسّوں سے باندھ کر لے آیا۔ اُس کے افسروں میں جس شخص نے ہاتھیوں کے بارے میں سب سے زیادہ دِلچسپی ظاہر کی تھی، وہ سیلوکس تھا، وہ بڑا اگر انڈیل آدمی تھا۔ اُس میں اتنی طاقت تھی کہ بیل کو سینگوں سے پکڑ کر اُس کی گردن مروڑ دیتا تھا۔ اُس نے سکندر کو اِس بات پر آمادہ کیا کہ ہاتھیوں کا ایک ریوڑ پالنا چاہیے۔ چنانچہ جب سکندر جنگل سے ہاتھی پکڑ کر لایا تو اُس نے اُن تمام ہاتھیوں کو سیلوکس کی نگرانی میں دے دیا تاکہ وہ اُنہیں سَدھانے کا بندوبست کر سکے۔

سکندر کا حکم ملتے ہی سیلوکس نے قابل مہاوتوں کا بندوبست کیا اور اُنہیں ہاتھیوں کو سَدھانے کے کام پر لگا دیا۔

سکندر ابھی ہاتھیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ سیلوکس اُس کے ساتھ تھا۔ سکندر جس ہاتھی کے پاس جاتا سیلوکس اُسے بتاتا کہ یہ ہاتھی کیسا ہے، کِس طبیعت کا ہے، اُسے کِس مہاوت نے سَدھایا ہے اور اُسے کیا کُچھ سِکھایا گیا ہے۔

اتنے میں نیارکس نے آکر اِطلاع دی کہ مشرق کی طرف کا ایک شہزادہ جو اپنا نام چندر گُپت بتاتا ہے، ملاقات کا خواہش مند ہے۔ سکندر نے اُسے وہیں بُلوا لیا۔ چندر گُپت نے سکندر کو یونانی انداز میں سلام کیا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اُس کا سر جھکا ہوا نہیں باوقار انداز میں اُوپر اُٹھا ہوا تھا۔

سکندر نے اُس کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ شیر کی سی دلیری، چیتے کی سی پھُرتی اور لومڑی کی سی چالاکی اُس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ اُس کا چوڑا ماتھا اُس کے بُلند حوصلہ ہونے کی دلیل تھا اور اُس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ مُشکلات سے گھبرانے والا نہیں ہے۔

"تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" سکندر نے پوچھا۔

"میرا نام چندر گُپت ہے اور میں شیش ناگ خاندان کا ایک فرد ہوں جس نے مہا راجا شیش ناگ سے لے کر مہا نند تک تین سو ساٹھ سال مگدھ پر بڑی شان سے حکومت کی ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ نیچ ذات کے مہا پدم نند نے دھوکے سے راجا

مہانند کو قتل کر کے خود مگدھ کی گدّی پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت مہا پدم نند کے بعد نند خاندان کا راجا سدھانند راج کر رہا ہے اور اُس نے شیش ناگ خاندان سے تعلّق رکھنے والے تمام مردوں کو چُن چُن کر قتل کروادیا ہے کہ کہیں اُن میں سے کوئی تخت کا دعوے دار نہ بن جائے۔ میں اپنی دائی کی مہربانی سے سدھانند کے ظُلم سے بچ نکلا اور پاٹلی پُتر سے ٹیکسلا تک، در در کی ٹھوکریں کھاتا، اب سکندر کے دروازے پر آیا ہوں، یہ اُمّید لے کر کہ شاید سکندر کی امداد سے اپنا کھویا ہوا راج حاصل کر سکوں۔"

اتنا کہہ کر چندر گُپت نے خاموشی اختیّار کی۔ پھر یکایک اُس کے لہجے میں تیزی آ گئی۔ اُس نے سکندر کی آنکھیں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"کیا سکندر شیش ناگ کے بیٹے کو اُس کا حق دِلا سکے گا؟ کیا وہ مگدھ کی اُس سلطنت پر حملہ کرے گا جو امبھی اور پورس کی ریاستوں سے کئی گنا بڑی ہے اور جس کی سرحدیں دریائے ستلج سے لے کر مشرق میں سمندر تک پھیلی ہوئی ہیں، جو شمال میں ہمالہ کے پہاڑوں اور جنوب میں نربدا کے پانیوں کو چھوتی ہے؟ یہ وہ سلطنت

ہے جس کا نیچ ذات کا راجا سخت ظالم ہے۔ لوگ اس کے ظُلم سے دُکھی ہیں اور اُس سے نجات حاصل کرنے کی دُعائیں مانگتے ہیں۔ کیا سکندر اپنے گھوڑے کی باگیں مگدھ کی طرف پھیرے گا؟ اگر سکندر اِس کا وعدہ کرے تو شیش ناگ کا بیٹا چندر گُپت یہ قول دیتا ہے کہ وہ خود اُس کے گھوڑے کی باگیں تھام کر اُسے ستلج سے پاٹلی پُتر تک لے جائے گا اور اس مُہم میں سکندر اور اس کی فوج کے کسی سپاہی کا بال تک بیکا نہ ہو گا، اور یوں سمندر تک کا سارا علاقہ سکندر کے دامن میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گرے گا۔"

چندر گُپت کے لہجے میں ایسی دلیری تھی کہ سکندر کے تن بدِن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصّے سے دھاڑا۔

"یہ کون بدمعاش ہے جو سکندر کی حمایت حاصل کرنے آیا۔ لیکن بات یوں کرتا ہے جیسے سکندر پر احسان کرنا چاہتا ہو؟ سلیوکس! اِسے پکڑو اور اِس کی گردن اُڑا دو۔"

لیکن چندر گُپت سکندر کے اِس حکم کو پہلے ہی سے اُس کے چہرے پر پڑھ چکا تھا۔ اُس نے ایک طرف کو جست لگائی اور ہوا ہو گیا۔ سلیوکس، نیارکس اور دوسرے افسروں اور سپاہیوں نے دوڑو پکڑو جانے نہ پائے؟ کا شور مچاتے ہوئے اُس کا تعاقب کیا، لیکن وہ سپاہیوں کے خیموں کی اوٹ میں ہوتا ہوا یوں غائب ہو گیا جیسے اُسے زمین نِگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو!

سکندر نے اگرچہ غصّے کی حالت میں چندر گُپت کی گردنِ اُڑا دینے کا حکم دے دیا تھا لیکن وہ دِل ہی دِل میں اُس کی دلیری پر عش عش کر رہا تھا۔ آج تک کِسی نے یُوں سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی تھی۔ اچانک اُسے وہ بحری ڈاکو یاد آگیا کہ جب وہ گرفتار ہو کر آیا اور سکندر نے اُس سے کہا:

”او کم بخت! تیری غارت گری نے سمندر کی وُسعتوں میں آہ و فریاد کا شور بپا کر رکھا ہے۔ اب تُو میرے قابو میں آگیا ہے تو بتا، تُجھے میرا قیدی بن کر رہنا منظور ہے یا میں اپنی تلوار سے تیری گردن اُڑا دوں۔“

تو اُس بحری ڈاکو نے بڑی دلیری سے جواب دیا تھا۔ "سکندر! تُو جوان مرد ہے اور جواں مردوں کا یہ کام نہیں کہ اپنے ہم پیشہ آدمیوں کو ذلیل کریں۔ تیرا پیشہ بھی لوٹ مار ہے اور میرا پیشہ بھی لوٹ مار ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں سمندری لُٹیرا ہوں اور تُو میدانی لٹیرا۔ لیکن اے سکندر! تُو خود انصاف کر۔ تُو میری لُوٹ مار کو جُرم سمجھتا ہے لیکن اپنی لُوٹ مار کو کیا کہے گا؟ میں تو ایک چھوٹا ساڈاکو ہوں، جو ایک جہاز یا قافلہ ہی لُوٹتا ہے، لیکن تُو اتنا بڑا لُٹیرا ہے کہ مُلکوں کے مُلک لُوٹ لیتا ہے اور خزانوں کے خزانے لُوٹ کر بھی تیرا دِل سیر نہیں ہوتا۔"

اس ڈاکو نے تو اپنی جان پہلے ہی ہتھیلی پر رکھی تھی، اِس لیے سکندر کے سامنے سب کُچھ کہہ گیا تھا۔ لیکن چندر گُپت کی تو بات ہی اور تھی۔ وہ سکندر کے سامنے سوالی بن کر آیا تھا۔ اپنا کھویا ہوا حق حاصل کرنے کے لیے اُس کی امداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے سکندر سے برابر کی حیثیت میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر یُوں ظاہر کیا تھا جیسے وہ سکندر پر بہت بڑا احسان کرنا چاہتا ہے۔

سکندر دیر تک اِن خیالوں میں کھویا رہا۔ اُسے اِس بات کا افسوس نہیں تھا کہ اُس کے افسر اور سپاہی چندر گُپت کو گرفتار نہیں کر سکے۔ بلکہ اُسے اپنے غصّے پر افسوس ہو رہا تھا، جِس کی وجہ سے اُس کی اور چندر گُپت کی ملاقات ادھوری رہ گئی۔ اُس نے مگدھ کی سلطنت کا ذکر کیا تھا، جو دریائے ستلج کے کناروں سے لے کر مشرق میں سمندر کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی۔

سکندر اِس سلطنت کے بارے میں معلومات حامل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں۔ سامنے سلیوکس کھڑا تھا اور اُس سے چند قدم دور نیارکس۔ سلیوکس نے اب تک سکندر کے ہر حکم کی تعمیل کی تھی، لیکن چندر گُپت کی گرفتاری وہ پہلا حکم تھا جِس کی وہ تعمیل نہ کر سکا تھا۔ سکندر نے اُس کی اداسی بھانپ لی اور مُسکراتے ہوئے کہنے لگا:

”تم یہ غم نہ کرو سلیوکس، کہ وہ تمہارے ہاتھ نہ آسکا۔ اُس کی حیثیّت ہی کیا ہے کہ ہم اُس کے بارے میں فکر کریں، لیکن اُس نے مگدھ کی ریاست کا ذکر کیا تھا، جو ستلج سے پرے مشرق میں سمندر کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایسی

بات ہے جس سے قدرتی طور پر ہمیں دِل چسپی ہونی چاہیے، ہم اُس سلطنت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پُوری پُوری معلومات جلد سے جلد۔“

”اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“سلیوکس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

شِیش ناگ کا حکم

چندر گُپت کو نہ زمین نِگل گئی تھی، نہ آسمان کھا گیا تھا، اور نہ ہی وہ کوئی چھلاوہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یونانی سپاہیوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا۔ بات صرف اتنی تھی کہ میں نے سارنگ بابا کے حکم سے چندر گُپت کو اُٹھا کر راجا امبھی کی ریاست سے باہر دریائے جہلم کے پار پہنچا دیا تھا۔

چندر گُپت کو دریائے جہلم کے پار پہنچا کے میں نے اُس سے کہا:

"شِیش ناگ کے بیٹے! تُم سکندر سے ملنا چاہتے تھے، سو مِل لیے۔ پر تمہیں یاد ہو گا کہ سارنگ بابا نے کہا تھا کہ تمہیں اِس سے کُچھ حاصل نہ ہو گا۔ راجا یا تو راجاؤں کی

بات پر کان دھرتے ہیں یا اپنے افسروں کی بات سُنتے ہیں اور اِس وقت تُم نہ راجا ہو، نہ افسر۔ میں نے سارنگ بابا کے حکم سے تمھیں یہاں پہنچا دیا ہے۔ شاید اِس لیے کہ قدرت تُم سے کُچھ کام لینا چاہتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اِس وقت تمہارا کٹا ہوا سر سکندر کے قدموں میں پڑا ہوتا اور تمہاری لاش کو چیلیں، کوّے اور گِدھ نوچ رہے ہوتے۔"

چندر گُپت بے اختیار میرے قدموں میں جھُک گیا اور کہنے لگا:

"آپ کے ہاتھوں مُجھے نئی زندگی ملی ہے۔ میں آپ کا یہ احسان اپنی زندگی کے آخری سانس تک نہیں بھولوں گا۔ میں جب آپ اور سارنگ بابا کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو اپنی بہن اُوشا سے امداد کا وعدہ لینے کے بعد میں نے آپ سے کہا تھا کہ مُجھے اطمینان ہے کہ جب بھی وقت آیا، جہاں بھی آیا، آپ میری مدد کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے، لیکن یہ بات میرے گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ وقت اتنی جلدی آ جائے گا۔ آپ نے مُجھے سکندر کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا ہے اور سکندر سے مُلاقات سے مُجھے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سبق ملا ہے۔ وہ یہ کہ

آدمی کو اُسی طاقت پر بھروسا کرنا چاہیے جو اُس کے بازوؤں میں ہو۔ ہمارے اپنے لیے تیّار ہو جاتے ہیں۔ کمزور کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ یہ دنیا طاقت کی دنیا ہے اور یہاں جینے کا حق صرف اُسی کو ہے جو طاقت ور ہو۔"

میں نے چندر گُپت کو اپنے قدموں سے اُٹھا کر سینے سے لگایا اور پھر اس کے شانے تھپکتے ہوئے کہا:

"تو جاؤ شِیش ناگ کے بیٹے، سکندر نے تمھیں جو سبق دیا ہے، وہی تمہارے لیے کافی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے چندر گُپت کو رُخصت کیا اور خود واپس ہوا۔ یہ واپسی ویسے ہی تھی جیسے میں اُوشا کو جنگل سے لے کر مہاراجا پورس کے پاس لایا تھا۔ بالکل اِسی طرح جب سارنگ بابا کی آواز میرے کان میں پڑی تو میں نے اپنے آپ کو سارنگ بابا اور اُوشا کے پاس بیٹھے پایا اور یُوں چونکا جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہوا ہوں لیکن میں جانتا تھا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ میں واقعی چندر گُپت کو

یونانی سپاہیوں نے خیموں کے پاس سے اُٹھا کر دریائے جہلم کے اُوشا کو پشکلاوتی کی طرف بھیج دیا۔ اُوشا کو شِیش ناگ کے مندر میں حاضری دینی تھی اور مُجھے سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق سُرخ ہیرے شِیش ناگ کی نذر کرنے تھے۔ سفید ہیرے میں تکشک ناگ کی بھینٹ کر چُکا تھا اور سُرخ ہیرے شیش ناگ کی امانت تھے۔

پشکلاوتی وہ جگہ تھی جہاں اُوشا پیدا ہوئی تھی اور جہاں میں نے اپنی زندگی کے پہلے دس سال گزارے تھے۔ پشکلاوتی اور اُس کے آس پاس کے خوب صورت منظر میرے دِل و دماغ میں بسے ہوئے تھے لیکن پشکلاوتی پہنچ کر میری نگاہوں نے جو کُچھ دیکھا وہ کبھی میرے تصوّر میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ شہر ایک بھیانک کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا اور دُور دُور تک کوئی گاؤں، کوئی بستی ایسی نظر نہیں آتی تھی جو تباہ نہ ہو چکی ہو۔ ہر طرف ویرانی اور تباہی کا راج تھا۔ جہاں کبھی انسان بستے تھے، اب وہاں اُلّو بول رہے تھے۔

میں اُوشا کو لے کر شِیش ناگ کے مندر میں پہنچا۔ مندر کا بیرونی حصّہ تباہ ہو چکا

تھا لیکن اُس کے اندر شِیش ناگ کی عظیم مورتی ابھی موجود تھی۔ مگر اب وہاں نہ کوئی پروہت تھا اور نہ کوئی پجاری، نہ کوئی چڑھاوے چڑھانے والا تھا اور نہ کوئی انہیں قبول کرنے والا۔ شہر کے کھنڈروں کی طرح مندر پر بھی ویرانی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اُوشا پھٹی پھٹی آنکھوں سے شِیش ناگ کی مورتی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو یہ اِرادہ کر کے آئی تھی کہ شیش ناگ کے سامنے اپنے ناچ کا نذرانہ پیش کرے گی لیکن مندر کی ویرانی نے اُس کے دِل پر خوف طاری کر دیا تھا۔

اُوشا کی حالت تو جو تھی سو تھی، خود میری حالت یہ تھی کہ مُجھے اپنا دِل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ کُچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا اور کیسے ہو گیا؟ میرے قبیلے پر تباہی کیسے آئی؟ کوئی زلزلہ آیا تھا یا آسمان سے کوئی آفت نازل ہوئی تھی؟

آخر میں نے حوصلہ کیا، سُرخ ہیرے اپنی جھولی سے نکال کر اپنے دامن میں

ڈالے اور شِیش ناگ کی مورتی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تکشک ناگ کے مندر میں جب میں نے سفید ہیرے نذر کیے تھے تو رواج کے مطابق، ساری رسمیں ادا کر چکنے کے بعد پروہت نے سیندور سے میرے ماتھے پر نشان لگایا تھا۔ لیکن یہاں شیش ناگ کے مندر میں اب نہ کوئی پروہت تھا اور نہ سیندور کا پیالہ۔ مگر جب میں نے سُرخ ہیرے شیش ناگ کی نذر کیے اور ساری رسمیں پوری کرلیں تو اُوشا آگے بڑھی اور اُس نے میرے ماتھے پر نشان لگا دیا۔ یہ نشان سیندور کی طرح سُرخ نہیں، خون کی طرح سُرخ تھا۔ اُوشا نے میرے ماتھے پر اپنی انگلی سے خون نکال کر نشان لگایا تھا۔ اور پھر اُس کے مُنہ سے چند الفاظ نکلے، وہ الفاظ جو اُس کی اپنی آواز میں نہیں تھے:

"جاؤ اور یہ ہیرے لے جا کر سکندر کے دامن میں ڈال دو۔"

میں نے حیرانی سے اُوشا کی طرف دیکھا۔ یہ الفاظ کہہ کر اُس کے ہونٹ پھر بند ہو گئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کسی غیبی اور پُراسرار طاقت نے اُوشا کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں اور قدرت یہی چاہتی ہے کہ یہ ہیرے جو میں شیش ناگ کے

لیے لایا تھا، سکندر کے پاس پہنچ جائیں۔ میں نے وہ ہیرے سمیٹ کر دوبارہ اپنی جھولی میں ڈال لیے اور پھر اُوشا کا ہاتھ تھام کر پشکلاوتی کی دردناک تباہی پر خُون کے آنسو بہاتا ہوا ٹیکسلا کو واپس ہوا۔

ٹیکسلا واپس پہنچ کر مُجھے معلوم ہوا کہ پشکلاوتی پر یہ تباہی کیوں اور کیسے آئی تھی۔ کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا اور نہ آسمان سے کوئی آفت نازل ہوئی تھی۔ یہ سکندر تھا جو میرے قبیلے اور اِس علاقے کے دوسرے قبیلوں پہ تباہی بن کر نازل ہوا تھا۔

سکندر جب کابُل سے روانہ ہوا تھا تو اُس نے فوج کے دو حصّے کر دیے تھے۔ ایک حصّے کو لے کر وہ چترال، باجوڑ اور سوات کے علاقوں کی طرف بڑھا اور دوسرا حصّہ اُس کے ایک جرنیل پردیکاس کی کمان میں دریائے کابل کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا پشکلاوتی اور اُس کے آس پاس کے علاقوں کو تباہ و برباد کرتا ہوا دریائے سندھ کی طرف روانہ ہوا۔

سکندر اور اُس کی فوجوں کو اُن علاقوں کو فتح کرنے میں ایک سال لگ گیا۔ کنٹک

اور اشواک قبیلے نے بڑے حوصلے سے سکندر کا مُقابلہ کیا۔ سکندر نے بہت دِنوں تک اُن کے قلعے مساگا کا مُحاصرہ کیے رکھا اور یہ محاصرہ اُس وقت ختم ہوا جب قبیلے کا سردار اتّفاقی طور ایک تیر سے زخمی ہوا کر مر گیا۔ سکندر نے قبیلے کے سات ہزار جوانوں کو یہ ضمانت دی تھی کہ اگر وہ قلعے کو خالی کر کے چلے جائیں تو انہیں کُچھ نہیں کہا جائے گا۔ قبیلے کے نوجوانوں نے سکندر کے قول پر اعتبار کرتے ہوئے قلعہ خالی کر دیا۔ لیکن جب وہ قلعہ خالی کر کے کُچھ دور گئے تو سکندر اور اُس کے سپاہی اُن پر ٹوٹ پڑے اور اُن میں سے ایک ایک کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

صرف یہی نہیں، سکندر نے اِس علاقے کے تمام چھوٹے بڑے قلعے ڈھا دیے اور شہروں اور بستیوں کو جی بھر کے لوٹنے کے بعد اُس نے تمام علاقے کو کابل کے راجا ششی گُپت کی ماتحتی میں دے دیا جو پہلے ہی اُس کی اِطاعت قبول کر چُکا تھا۔

اِس کے بعد سکندر دریائے سندھ کی طرف بڑھا اور وہاں اُس کی فوج کا وہ حصّہ بھی آملا جو اُس نے پردیکاس کی کمان میں دیا تھا، اور پھر وہاں سے دریائے سندھ کو

پار کر کے راجا امبھی کی ریاست میں داخل ہوا تھا۔

یہ وہ سکندر تھا جو میرے قبیلے کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کے لیے تباہی اور بربادی بن کر آیا تھا، اور اب مجھے شیش ناگ کے سُرخ ہیرے بھی اُسی کے دامن میں ڈالنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں خوشی کا اظہار کروں یا آنسو بہاؤں۔ اُوشا کے لیے یہ سب کُچھ ایک خواب سا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔پشکلاوتی۔۔۔۔اُس کے خوابوں کا پشکلاوتی۔۔۔۔۔ تباہ اور برباد ہو چکا ہے۔ وہ تو اپنے دل میں یہ آرزو بسائے ہوئے تھی کہ چاہے دُور سے ہی سہی، اپنے اُس باپ کو ایک نظر دیکھ سکے جس نے اُسے پیدا ہوتے ہی دریائے سندھ کی لہروں کی نذر کر دیا تھا۔ لیکن اُس کا یہ سپنا ٹُوٹ گیا تھا۔ اُسے ایک چُپ سی لگ گئی تھی۔ وہ یُوں خاموش تھی جیسے ہنسی اُس کے ہونٹوں سے روٹھ گئی ہے۔ جیسے وہ زبان ہلانا بھول گئی ہے۔

اور تو اور سارنگ بابا بھی خاموش تھے۔ اُن کی یہ خاموشی مُجھے بے حد پُر اسرار لگ رہی تھی۔ میں نے اُنہیں پشکلاوتی کی تباہی کے متعلّق بتایا تھا تو اُنھوں نے یوں سُنا

تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ سُرخ ہے سکندر کو دیے جانے کا سُن کر بھی وہ خاموش رہے تھے۔ مُجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ساری باتیں پہلے ہی اُن کے علم میں تھیں اور مُجھے پشکلاوتی بھیجنے سے ان کا مطلب صرف اتنا تھا کہ پشکلاوتی کے تباہ ہونے کی بات مُجھے بھی معلوم ہو جائے اور میں سُرخ ہیرے سکندر کے حوالے کرنے کی ہدایت بھی شیش ناگ سے لے آؤں۔

جس شیش ناگ کے علاقے کو سکندر نے بُری طرح تباہ اور برباد کر ڈالا تھا، اُسی شِیش ناگ نے مُجھے ہدایت کی تھی کہ ہیرے سکندر کے دامن میں ڈال دوں۔ کیا کوئی دُشمن کے ساتھ اِس قدر فراخ دِلی برت سکتا ہے؟

خوفناک مُقابلہ

آخر جشن کا دِن آ پہنچا۔ اس کے لیے ٹیکسلا سے باہر ایک وسیع میدان میں بندوبست کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی گئیں، ان دیوتاؤں کے نام پر بھی جو یونانیوں کے اپنے دیوتا تھے اور اُن دیوتاؤں کے نام پر بھی جنہیں کابل کی وادی سے لے کر دریائے جہلم تک کے علاقے میں پوجا جاتا تھا۔

یہ قُربانیاں اُس مندر میں دی گئی تھیں جو میدان کے ایک سِرے پر بنا ہوا تھا اور جو ٹیکسلا کے بانی تکشک مہاراج کے نام پر تکشک مندر کہلاتا تھا۔

جشن سکندر اور اُس کے سپاہیوں کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ مقدونیہ سے چل کر اب تک وہ کتنی ہی جگہوں پر جشن منا چُکے تھے اور نہ سکندر کے لیے دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں کرنا کوئی نئی بات تھی۔ دوسری جگہوں کے علاوہ اس نے دریائے سندھ کو عُبور کرنے سے پہلے بھی دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی تھیں۔ اِن قربانیوں کے لیے تین ہزار بیل اور دس ہزار بھیڑیں سکندر کے دوست راجا امبھی نے مہیّا کی تھیں اور سکندر اِن قربانیوں کے لیے ایک نہ دو، پورے تیس دِن دریائے سندھ کے کنارے ٹھہرا رہا تھا۔ اُس نے یہ قربانیاں اِس لیے دی تھیں کہ وہ ایک پُر اسرار سرزمین میں قدم رکھنے والا تھا اور چاہتا تھا کہ یونان، مصر، ایران اور کابل کی طرح اِس پُر اسرار سرزمین میں بھی دیوتا اُس کی مدد کریں۔

لیکن ٹیکسلا کے میدان میں قربانیاں یہاں کے راجا اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ دوستی کی خوشی میں تھیں۔ یہ قربانیاں جہاں زیوس دیوتا کے نام پر تھیں، وہیں اِندر دیوتا اور شِیش ناگ کے نام پر بھی تھیں۔ یہ پہلا جشن تھا جس میں

سکندر کے سپاہیوں کے علاوہ یہاں کے لوگ بھی حصّہ لے رہے تھے۔

میں اِس سے پہلے دو جشن دیکھ چکا تھا۔ ایک اُس بستی کے سردار کی طرف سے تھا جس کی بیوی کے جسم سے ہم نے سانپ نکالا تھا اور دوسرا جشن مہاراجا پورس کے دربار کا جشن تھا۔ لیکن یہ تیسرا جشن اُن دونوں سے بالکل مختلف تھا۔ اِس لیے کہ یہ سکندر اور اُس کے سپاہیوں کا جشن تھا۔

قربانیاں ہو چُکیں تو کھیل تماشے شروع ہوئے۔ لیکن تماشے کم تھے اور کھیل زیادہ تھا۔ سکندر کے سپاہیوں کے درمیان دوڑیں لگانے، کُشتیاں لڑنے اور جسمانی کرتب دِکھانے کے مُقابلے ہو رہے تھے۔ سکندر اپنی بیری رُخسانہ کے ساتھ ایک اُونچے تخت پر بیٹھا اِن مُقابلوں کو دیکھ رہا تھا۔ سکندر کے کمانڈر اور افسر بھی موجود تھے اور راجا امبھی اور اُس کے درباری بھی، اور اُن سب کی نظریں سپاہیوں کے پھُرتیلے جسموں پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر مُقابلے کے بعد جیتنے والا سپاہی سکندر کے سامنے پیش ہوتا اور انعام پاتا۔

کوئی تیسرے پہر تک یونانی سپاہیوں کے یہ کھیل اور مُقابلے جاری رہے۔ اب راجا امبھی کی باری تھی۔ اُس نے بھی سکندر کے کھیل تماشوں کا جواب دینے کے لیے پوری تیّاریاں کر رکھی تھیں۔

سب سے پہلے رقص کرنے والے ہاتھی آئے۔ سکندر اور اُس کے سپاہیوں نے اِن ہاتھیوں کا ناچ پہلے بھی دیکھا تھا، لیکن یہ ناچ پہلے ناچ سے بالکل مختلف تھا۔ اب اُنہیں ایک نئی دُھن پر ناچنا سکھایا گیا تھا۔

ہاتھیوں کے بعد بازی گر آئے، اور جب اِن بازی گروں نے اپنے کرتب دِکھانے شروع کیے تو سکندر کے سپاہی اِن کرتبوں کو بھول گئے جو اُن کے ساتھی دِن بھر بڑے جوش سے دِکھاتے رہے تھے۔ اِن بازی گروں میں ہر بازی گر اپنا جواب آپ تھا۔

بازی گروں کے بعد جادُوگروں کی ایک ٹولی آئی اور اُس نے جادُو کے چند کرتب دِکھائے۔ جادُوگروں کے بعد ناچنے والوں کی ٹولیاں آئیں اور ہر ٹولی نے اپنا اپنا

کمال دِکھایا۔

اس اِثنا میں شام ہو چُکی تھی۔ میدان میں جگہ جگہ مشعلیں روشن ہو گئیں۔ سارا میدان دِن کے اُجالے کی طرح روشن ہو گیا اور جشن مشعلوں کی روشنی میں اُسی طرح جاری رہا جس طرح دِن کے اُجالے میں ہو رہا تھا۔

ناچنے والی ٹولیوں کے بعد اِن سپیروں اور جوگیوں کی باری آئی جو سانپ کاٹے کے علاج کے لیے، لشکر کے قریب، ایک خیمے میں ٹھہرائے گئے تھے۔

پہلے ایک سپیرے نے اپنی بِین پر سانپ کے رقص کا تماشا دِکھایا۔ پھر دوسرے سپیرے نے دو سانپوں کی لڑائی دِکھائی۔ ایک اور سپیرے نے اپنے بھاری بھر کم اژدہے جیسے سانپ کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا اور اِسی حالت میں قلابازیاں کھا کر دِکھائیں۔ اُس کی یہ قلابازیاں دیکھ کر بازی گر بھی حیران رہ گئے کیونکہ یہ سپیرا ایک لحاظ سے اُن سے بھی بڑھ گیا تھا۔

پھر ایک ننگ دھڑنگ جوگی آیا اور تیز نوکیلی کیلوں کے بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی

دیر بعد جب وہ بستر سے اُٹھا تو اُس کا بدن ذرا سا بھی زخمی نہیں ہوا تھا۔ کوئی بھی کیل اُس کے جسم میں نہیں چُبھی تھی۔

اِس کے بعد ایک جوگی آیا اور ننگے پاؤں دہکتے ہوئے کوئلوں پر سے گزرا، دیکھتے ہوئے کوئلوں نے اس کے پیروں پر ذرا بھی اثر نہ کیا۔

اور جب سپیرے اور جوگی اپنے اپنے کمالات دِکھا چُکے تو راجا امبھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر سکندر کے سامنے آیا اور کہنے لگا:

"مہاراج! اب اُوشا اور انوشا اور سارنگ مہاراج آپ کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ وہ ناگوں کے ناگ شیش ناگ کی طرف سے آپ کے لیے ایک انمول تحفہ لائے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی راجا امبھی نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ سارنگ بابا، میں اور اُوشا سکندر کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور جھک کر آداب کیا۔ اُوشا نے شیش ناگ کے سُرخ ہیروں کا تھال اُٹھا رکھا تھا۔ مشعلوں کی روشنی میں یہ ہیرے دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ سارنگ بابا نے دونوں ہاتھ

سکندر کی طرف بڑھا کر کہا:

”سکندر! تُو وہ ہے جسے لوگ رہتی دُنیا تک یاد رکھیں گے۔ تُو نے وہ کُچھ کیا ہے جو تُجھ سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ تُو وہاں پہنچا ہے جہاں تُجھ سے پہلے کوئی پہنچا۔ ہم دیوتاؤں کے دیوتا اور ناگوں کے ناگ شِیش ناگ کے حکم پر تیرے لیے ایک تحفہ لائے ہیں۔“

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے اُوشا کو اشارہ کیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہیروں کا تھال سکندر کی طرف بڑھا دیا اور سکندر نے تھال لے کر پہلے ہیروں کی طرف اور پھر اُوشا کی طرف دیکھا اور کہا:

”اوہ! شِیش ناگ کی بیٹی سکندر کے لیے سُرخ ہیرے لائی ہے۔“

اُوشا کوئی جواب دیے بغیر ایک قدم پیچھے ہٹ کر میرے برابر آ کھڑی ہوئی۔ سکندر نے سارنگ بابا سے پوچھا:

”یہ کِس علاقے کے ہیرے ہیں؟“

سارنگ بابا نے جواب دیا۔ ”یہ ایسے ہیرے نہیں ہیں جو کسی علاقے میں پائے جاتے ہوں۔ یہ کسی دھرتی سے نہیں نکلے، کسی پہاڑ، کسی چٹان کے نیچے سے نہیں نکالے گئے۔ یہ وہ ہیرے ہیں جو قدرت نے آدمی کے گوشت، خُون، ہڈّیوں اور مٹّی سے بنائے ہیں اور ایسے ہیرے قدرت بھی روز روز نہیں بناتی۔“

سکندر نے تھال سے ایک ہیرا اُٹھا کر دیکھا اور پھر کہنے لگا:

”تمہاری بات عجیب ہے، اور ایک حد تک ناقابلِ یقین بھی۔ لیکن یہ دُنیا ناقابلِ یقین باتوں سے بھری ہوئی ہے۔“

اتنے میں ایک بوڑھا سپیرا آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ ”مہاراج، کیا میں یہ ہیرے دیکھ سکتا ہوں؟“

میں نے اُس بوڑھے سپیرے کی طرف دیکھا اور چونک سا گیا۔ یہ وہی سپیرا تھا جو اُس روز سارنگ بابا کے ساتھ سپیروں کی باتوں کے دوران میرے گلے میں جھُولتے ہوئے شانی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سکندر کی اِجازت پا کر اُس

سپیرے نے اُن ہیروں کو پہلے دیکھا اور پھر سُونگھا۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا۔

"مہاراج! سارنگ بابا سچ کہتے ہیں کہ یہ ہیرے آدمی کے گوشت، خُون اور ہڈّیوں سے بنے ہیں۔ لیکن مجُھے اِن سے جِس گوشت اور خُون کی بُو آرہی ہے وہ میرا اپنا گوشت اور میرا اپنا خُون ہے۔ میرے بیٹے کا خون ہے۔ مہاراج! یہ میرے بیٹے کے قاتل ہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟"

"میں سچ کہتا ہوں مہاراج! یہ انوشا کے گلے میں جو سانپ جھُول رہا ہے، یہ میرے بیٹے کا سانپ ہے۔ مجُھے یہ سانپ دیکھتے ہی شک ہو گیا تھا اور یہ ہیرے سُونگھنے کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا ہے کہ یہی میرے بیٹے کے قاتل ہیں۔"

"ہم تمہارے ساتھ انصاف کریں گے، فریادی۔" سکندر نے کہا، پھر وہ سارنگ بابا سے مخاطب ہوا:

"سارنگ بابا! یہ شخص جو کُچھ کہہ رہا ہے، وہ تُم نے سُنا؟ تُم اِس کے جواب میں کیا

کہتے ہو؟"

سارنگ بابا نے جھک کر آداب کیا اور پھر کہنے لگے۔ "اے سکندر! اے بادشاہوں کے بادشاہ، ہمیں نہیں معلوم کہ اِس شخص کا بیٹا کون تھا اور کہاں تھا۔ ہم تو صِرف اِتنا جانتے ہیں کہ ہم اور انوشا جب کشمیر میں تکشک مہاراج کے مندر سے ویری ناگ کی طرف چلے تھے تو راستے میں ہمارا قیام ایک ایسی بستی میں ہوا جس کا سردار ہمارا دوست تھا۔ اُس کی بیوی ایک مدّت سے بیمار تھی۔ ہم نے اُسے دیکھا تو اُس کا اصل مرض جان گئے۔ ایک سانپ جونک کی طرح اُس کے کلیجے سے چمٹا ہوا اُس کا خُون چُوس رہا تھا۔ ہم نے وہ سانپ نکالا تو وہ ٹھیک ہو گئی۔ اس کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں سردار نے تین دِن تک جشن منایا۔

اس جشن میں کھیل تماشے دِکھانے والی مختلف ٹولیاں دُور دُور سے منگوائی گئی تھیں۔ جب یہ سب لوگ اپنا اپنا کمال دِکھا چُکے تو سردار نے تمام لوگوں کے سامنے بتایا کہ یہ جشن میری بیوی کی بیماری دور ہونے کی خوشی میں منایا جا رہا ہے اور اِس بیماری کو دُور کرنے کا سہرا سارنگ بابا اور انوشا کے سر ہے، جنہوں نے

اِس سانپ کو میری بیوی کے جسم سے نکالا تھا۔

یہ بتانے کے بعد سردار نے ہم سے کوئی تماشا دِکھانے کے لیے کہا۔ ہم سردار کے تخت پوش کے سامنے، کھُلی جگہ میں آئے ہی تھے کہ لوگوں کے مجمع میں سے ایک شخص چھلانگ لگا کر ہمارے سامنے آگیا اور وہ سانپ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو ہم نے سردار کی بیوی کے جسم سے نکالا تھا۔ ہم نے بتایا کہ تُم بہت دیر سے آئے ہو۔ اِس بات کو تو پندرہ دِن ہو چُکے ہیں۔ وہ سانپ اب یہاں نہیں ہے۔ ہم اُس سانپ کو ایک دوا بنانے کے لیے استعمال کر چُکے تھے۔ جب اُس شخص نے دیکھا کہ وہ سانپ ہمارے پاس نہیں ہے تو وہ سردار سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ مُجھے یہ شخص کوئی دھوکے باز معلوم ہوتا ہے۔ میں نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے جوگی اور سنیاسی کا روپ دھار رکھا ہے۔ میں نے سینکڑوں قسم کے سانپ دیکھے ہیں، لیکن یہ بات آج تک کہیں سُنی نہ دیکھی کہ کوئی سانپ کسی آدمی کے جسم میں داخل ہو گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانپ پہلے اِس کے پاس موجود تھا اور اِس نے ہاتھ کی صفائی دِکھاتے ہوئے اُسے آپ کی بیوی کے

جسم سے نکال دیا۔

آپ کی اجازت سے میں اس مداری سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔

ہم نے اُسے بہت سمجھایا کہ تُم شاید مداریوں کی بنسریاں بند کرنے والے کھلاڑی ہو لیکن ہم مداری نہیں ہیں۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ وہ ہمارے ساتھ مُقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ کسی طرح ٹلتا نظر نہ آیا تو ہم اپنی طبیعت پر جبر کر کے مُقابلہ کرنے پر راضی ہو گئے۔

اُس نے اپنے تھیلے میں سے ایک چھوٹی سی پٹاری نکالی اور اُس کے اندر سے ایک سانپ نکال کہنے لگا کہ یہ وہ سانپ ہے کہ پتھّر کو ڈسے تو پتھّر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس نے ہمیں اپنا ہاتھ آگے کرنے کو کہا، ہم نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ اُس سانپ نے ہمارے ہاتھ پر کاٹا لیکن اُس کے زہر نے ہم پر کُچھ بھی اثر نہ کیا۔

اب ہماری باری تھی۔ ہم نے وہی سانپ اُس آدمی سے لیا اور انوشا بیٹے کو بین پر ایک خاص دُھن بجانے کے لیے کہا۔ سانپ اُس دُھن پر مست ہو گیا اور پھر اُس

نے ایسے زور کی پھُنکار ماری کہ اُس شخص کا سارا جسم سر سے پاؤں تک خُشک لکڑی کی طرح جلنے لگا اور اُس نے بھاگ کر ایک تالاب میں چھلانگ لگادی۔

اس کے چھلانگ لگاتے ہی سارا تالاب دہکتے ہوئے الاؤ کی شکل اختیار کر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا اور تالاب کی تہہ پتھر کی سِل کی طرح سخت ہو گئی۔ وہاں اُس شخص کی نہ لاش تھی، نہ ہڈّیاں اور نہ ہڈّیوں کی راکھ۔

ہم اُس خشک تالاب کو مٹّی سے ڈھانپ کر ویری ناگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ہم ویری ناگ سے بھی بہت آگے کیسر ناگ سے ہو کر واپس تالاب کی جگہ کے پاس آئے تو اُس کے اندر سے ہمیں سفید اور سُرخ ہیرے ملے۔ سفید ہیرے ہم نے پرور پُور میں تکشک مہاراج کی بھینٹ چڑھا دیے اور سُرخ ہیرے شِیش ناگ کے لیے رکھ لیے۔ پھر اُنہیں شِیش ناگ کی ہدایت پر سکندر کے دامن میں ڈال دیا۔

اے سکندر! یہ تھا ہیروں کا ماجرا جو ہم نے بیان کر دیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ

شخص اِس بوڑھے سپیرے کا بیٹا تھا یا نہیں۔ لیکن وہ سانپ اب تک ہمارے پاس ہے، اور انوشا کے گلے میں جھُول رہا ہے۔ یہ انوشا کا بھائی ہے اور ہم اُسے شانی کہہ کر پکارتے ہیں۔"

سکندر کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے کہا۔ "سارنگ بابا! کیا تُم اپنے اِس سانپ کا وہ تماشا ایک بار پھر ہمیں دِکھا سکتے ہو؟"

اس سے پہلے کہ سارنگ بابا کُچھ جواب دیتے، اُس بوڑھے سپیرے نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مہاراج! یہ میرے بیٹے کے قاتل ہیں۔ یہ اپنی زبان سے سب کُچھ بتا چُکے ہیں۔ اِس کے بعد کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ ہیرے میرے بیٹے کے خُون سے بنے ہیں اور یہ سانپ میرے بیٹے کا سانپ ہے۔ انصاف کیجیے، مہاراج! میرے ساتھ انصاف کیجیے۔"

سکندر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے ساتھ انصاف کریں گے۔ اُنہوں نے تمہارے بیٹے کے ساتھ مُقابلہ کیا اور یہ سانپ حاصل کیا۔ تُم اِن کے ساتھ مُقابلہ

کر کے یہ سانپ واپس حاصل کر سکتے ہو۔"

"اے سکندر! ایسے مقابلے ہماری شان کے خلاف ہیں۔" سانگ بابا بولے۔

سارنگ بابا کی بات سُن کر بوڑھے سپیرے نے بھی وہی وہ بات کہی جو اُس کے بیٹے نے کہی تھی۔ "یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں میدان میں آنے سے ڈر لگتا ہے۔ تُم میرے بیٹے کے قاتل ہو اور میں تُم سے وہ انتقام لوں گا کہ دیکھنے والے کانپ اُٹھیں گے۔"

سارنگ بابا نے بڑی نرمی سے کہا۔ "میرے دوست! کسی کی جان لینا یا کِسی کو تکلیف پہنچانا ہمیں بالکل پسند نہیں۔ تمہارے بیٹے کے ساتھ جو کُچھ ہوا، وہ ایک اتّفاقی بات تھی۔ اِس میں ہمارے اِرادے سے زیادہ خود تمہارے بیٹے کی ضِد کا دخل تھا۔ کہو تو ہم شانی کو تمہارے حوالے کر دیں اور کہو تو تمہارے پاؤں پکڑ کر تُم سے معافی مانگ لیں۔"

بوڑھے سپیرے نے سارنگ بابا کی بات کا جواب دینے کے بجائے سکندر سے کہا۔

”مہاراج! اِسے حکم دیں کہ یہ میرے مُقابلے میں آئے۔ اب تک اِسے نہ جانے کِن اناڑیوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے جِس کی وجہ سے اِس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آج اِسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔“

سکندر نے سارنگ بابا سے کہا۔ ”سارنگ بابا! تمھیں اِس کے ساتھ مُقابلہ کرنا ہے۔ باتیں بنانا چھوڑو اور اِس کے ساتھ مُقابلہ کرو۔“ اس پر سارنگ بابا نے اُس سپیرے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اُس وقت تمہارے بیٹے کی ضِد نے ہمیں مُقابلے پر مجبور کیا تھا اور آج تُم مجبور کر رہے ہو۔ چلو، یوں ہی سہی۔ لیکن ہم دو ہیں اور تُم ایک۔ تُم اپنے ساتھ جس کو چاہو، شامل کر سکتے ہو۔“

یہ سُن کر بوڑھے سپیرے نے دوسرے سپیروں کو آواز دی۔ دوسرے ہی لمحے چار سپیرے اُس کے پاس آ موجود ہوئے۔ سارنگ بابا نے اُوشا کو ایک طرف ہٹا دیا اور سکندر کے سامنے، ذرا پیچھے ہٹ کر، کھُلی جگہ کھڑے ہوئے۔

”پہلے تُم وار کرو گے یا میں کروں؟“ بوڑھے سپیرے نے پُوچھا۔

”تُم پہلے اپنا وار کر سکتے ہو۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”لیکن یاد رکھنا، اپنے انجام کے تُم خود ذمّے دار ہو گے۔“

”میرے انجام سے پہلے تمہیں اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔“

”ٹھہرو!“ اچانک میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے؟“ بوڑھے سپیرے نے پُوچھا۔

”سارنگ بابا میرے گُرو ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اِن کے ساتھ مُقابلہ کرنے سے پہلے تمہیں میرے ساتھ مُقابلہ کرنا ہو گا۔ مُجھے ہرادو تو پھر سارنگ بابا سے مُقابلہ کرنے کی بات کرنا۔“

”ارے انو شا مہاراج۔“ بوڑھے سپیرے نے حقارت سے کہا۔ ”تم ہرانے کی بات کرتے ہو، تمہیں تو میں یوں چٹکیوں میں اُڑادوں گا، یُوں۔“

سارنگ بابا ایک طرف ہٹ گئے۔ میں نے شانی کو سارنگ بابا کے حوالے کیا اور پھر اُس بوڑھے سپیرے کے سامنے آ کر کہا۔ ”سارنگ بابا نے تمہیں پہلا وار

کرنے کی اجازت دی تھی۔ میری طرف سے بھی اجازت ہے۔ تُم پہلا وار کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" سپیرے نے کہا۔ "بال ہٹ کا کوئی علاج نہیں۔ لاؤ اپنا ہاتھ آگے کرو۔ میرے پاس وہ سانپ ہے جِس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔"

میں نے بڑے اطمینان سے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ بوڑھے سپیرے نے اپنے تھیلے سے ایک سانپ نکالا۔ کوئی دو ہاتھ لمبا تھا۔ سانپ کی گردن پکڑے ہوئے وہ اُسے میرے ہاتھ کی طرف لایا۔ جیسے ہی سانپ کا مُنہ میرے ہاتھ کے قریب آیا، اُس کی زبان تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی اور اُس نے میرے ہاتھ پر دانت گاڑ دیے۔

اِن سپیروں نے شاید یہ سمجھا تھا کہ سانپ کے ڈستے ہی میں زمین پر ِگر کر تڑپنے لگوں گا لیکن میں اُسی طرح اِطمینان سے کھڑا رہا جیسے کُچھ ہوا ہی نہیں، اور وہ سانپ جس نے مُجھے ڈسا تھا، بوڑھے سپیرے کے ہاتھ سے چھُوٹ کر زمین پر ِگر

پڑا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

بوڑھا سپیرا اپنے مرے ہوئے سانپ کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہے۔

"مہاراج، تُم چاہو تو ایک اور وار کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" سکندر کی آواز گونجی۔ "یہ اپنا وار کر چُکا ہے۔ اب تمہیں اِس کا جواب دینا ہے۔"

میں نے ایک پھُونک مارتے ہوئے، تیزی کے ساتھ، بوڑھے سپیرے اور اُس کے چاروں ساتھیوں کے گرد ایک چکّر لگایا تو اُن کے چاروں طرف آگ کا حلقہ بن گیا۔ میں نے سپیروں سے کہا:

"مہاراج، ذرا اِس آگ کے حلقے سے باہر نِکل کر دِکھائیں تو مانوں۔"

آگ کا یہ حلقہ اگرچہ خاصا بڑا تھا اور اُنہیں اُس کی تپش محسوس نہیں ہو رہی تھی،

لیکن اُس سے باہر نکلنا اُن کے لیے کسی طرح بھی مُمکن نہ تھا، اِس لیے کہ وہ کوئی معمولی آگ نہ تھی۔

پھِر میں نے آگ کے حلقے سے مخاطب کہا۔ "جا، اُنہیں میدان کے اُوپر ہوا میں دو چکّر لگوا۔"

اتنا کہنے کی دیر تھی کہ آگ کے حلقے میں حرکت ہوئی اور اُس نے پانچوں کے پانچوں سپیروں کو ہوا میں اُڑتے ہوئے پرندوں کی طرح، میدان کے دو چکّر لگوائے۔ اُنہیں ہوا میں اُڑتے دیکھ کر سپاہیوں نے خوب تالیاں بجائیں۔

دو چکّروں کے بعد سپیرے آگ کے حلقے سمیت، زمین پر اپنی پہلی جگہ واپس آ گئے۔ اِس کے ساتھ ہی آگ کا حلقہ غائب ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "کہیے مہاراج، اب کیا ارادے ہیں؟"

یہ الفاظ ابھی میرے مُنہ سے نکلے ہی تھے کہ بوڑھے سپیرے کے ایک ساتھی نے بڑے غصّے سے کہا۔ "ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تُم سانپ کے وار کا جواب جادُو

کے وار سے دو گے۔ جادُو ہم بھی جانتے ہیں۔ یہ لو۔“

یہ کہہ کر اُس نے زور زور سے زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے اور مُنہ میں کُچھ منتر پڑھتے ہوئے میرے گرد ایک چکّر لگایا۔ آن کی آن میں میرے کندھوں تک پتھّر کی ایک دیوار بن گئی۔ وہ سپیرا کہنے لگا۔

”لو، اب اپنے ہاتھ پیر ہلائے بغیر اِسے ہٹاؤ تو جانوں۔“

”مہاراج، تُم نے غَلَط سمجھا۔ میں کوئی جادُو نہیں جانتا اور اگر میرے پاس کوئی جادُو ہے بھی تو وہ میری بین کا جادُو ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے بین ہونٹوں سے لگائی اور بجانے لگا۔ یہ شانی کی دُھن تھی۔ سارنگ بابا کے ہاتھ میں جھُولتا ہوا شانی یہ دُھن سُن کر پہلے چونکا اور پھر اُن کے ہاتھ سے اُتر کر رینگتا ہوا میرے گرد بنی ہوئی پتھّر کی دیوار کے پاس آ گیا۔

میں بِین بجاتا رہا اور شانی پتھر کی دیوار کے پاس کُنڈلی مارے بیٹھا جھُومتا رہا۔ پھر سارا میدان اُس کی زور دار پھُنکار سے گُونج اُٹھا اور پتھّر کی دیوار یُوں ٹکڑے

ٹکڑے ہو کر چاروں طرف بِکھر گئی جسے وہ پتھّر کی نہیں ریت کی دیوار تھی۔

شانی واپس سارنگ بابا کے پاس چلا گیا اور میں نے اُن سپیروں سے کہا۔ ”مہاراج، اب کیا حکم ہے؟“

میری بات سے تاؤ کھا کر ایک دوسرا سپیرا آگے بڑھا۔ اُس کے پاس ایک بڑی سی پٹاری تھی۔ اُس نے پٹاری کا ڈھکنا اُٹھایا تو ایک سانپ پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سانپ اُٹھا کر باہر نکالا اور زمین پر رکھ دیا۔

سانپ کیا تھا، اچھّا خاصا اژدہا تھا۔ اُس کا چِت کبرا جسم مشعلوں کی روشنی میں کُچھ زیادہ ہی خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ اُس کی دو شاخہ زبان آگ کے شُعلے کی طرح لپک رہی تھی۔ سپیرے نے مُجھ سے کہا:

”انوشا مہاراج! یہ میرا بیٹا ہے اور تُم جیسے چار پانچ اور ہوں تو یہ اُن کو بھی سموچا نِگل سکتا ہے۔“

میں نے اِس اژدہے کی طرف دیکھا۔ سپیرے کی بات کُچھ غَلَط بھی نہ تھی۔ اُسے

دیکھ کر مُجھے وہ اژدہا یاد آ گیا جس پر سوار ہو کر کیسر ناگ چودھویں رات کے چاند کی چاندنی میں جنگل کی سیر کو نکلتا تھا۔

سپیرے کا اشارہ پا کر سانپ تیر کی طرح میری طرف بڑھا اور جیسے ہی اُس نے اپنا مُنہ کھولا، میں نے اُس میں تھُوک دیا۔

سانپ ایک دم یُوں پلٹا جیسے اُس کی جان پر بن گئی ہو۔ اُس کا تڑپنا پھڑکنا اُس بُوڑھے سپیرے کے سانپ سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ بُوڑھے سپیرے کے سانپ کی طرح یہ سانپ بھی تھوڑی دیر تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

میں نے اُن سپیروں سے کہا:

"مہاراج، اب کیا حکم ہے؟"

اِس پر بُوڑھے سپیرے کا تیسرا ساتھی طیش میں آ کر آگے بڑھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک باریک سا سانپ تھا، جِس کی لمبائی مُشکل سے ایک بالشت ہو گی۔ وہ میرے پاس آ کر غصّے سے بولا:

"ہم اب تک تمہاری عُمر کا لحاظ کرتے رہے ہیں۔ لیکن تُم شاید کسی اور ہی مٹّی کے بنے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔"

"میری مٹّی پر شِیش اور تکشک۔۔۔۔۔"

"باتیں نہ بناؤ۔" سپیرے نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں تُم میرے وار سے کیسے بچتے ہو۔ اپنا مُنہ کھولو۔"

"یہ لو۔" میں نے کہا اور بڑے اطمینان سے مُنہ کھول دیا۔ سانپ کی دو شاخہ زبان تیزی حرکت میں آئی اور اُس نے میری زبان پر ڈس لیا۔

اور اِس کے بعد جو کُچھ ہوا، وہ دیکھنے والوں کی توقّع کے بالکل اُلٹ تھا۔ میں نہ لڑکھڑایا اور نہ بے ہوش ہوا۔ اُسی طرح اطمینان سے کھڑا رہا، جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ اِدھر سانپ پہلے بے ہوش سا ہوا اور پھر اُس کا جسم غُبارے کی طرح پھُولنے لگا۔ ذراسی دیر بعد ہی وہ پھُول کر کُپّا ہو گیا۔

سانپ کی یہ حالت دیکھ کر سپیرے نے گھبرا کر اُسے نیچے پھینک دیا۔ زمین پر

گِرتے ہی وہ سانپ ایک دھماکے سے پھٹا اور ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سپیرا مارے شرمندگی کے سر جھُکا کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے ساتھ ہی بوڑھے سپیرے کا چوتھا ساتھی چھلانگ لگا کر میرے سامنے آیا اور آتے ہی سانپ کی طرح کُچھ اِس زور کی پھُونک ماری کہ میرے اِرد گرد آگ کا ایک الاؤ روشن ہو گیا۔ آگ کے اِس الاؤ نے مُجھے پاؤں سے سر تک اِس طرح ڈھانپ لیا تھا، جیسے مُجھ پر آگ کی چادر ڈال دی گئی ہے۔

لیکن تھوڑی دیر بعد جب آگ کی یہ چادر ہٹی تو میں اُسی طرح صحیح سلامت کھڑا تھا۔ میرا بال تک بیکا نہ ہوا تھا۔ میرے جسم کے کپڑے تک آگ کی زد سے محفوظ رہے تھے۔ وہ سپیرا اپنے وار کو ناکام دیکھ کر میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے یُوں دیکھ رہا تھا جیسے اُس کی آنکھیں ابھی باہر آ جائیں گی۔

بُوڑھا سپیرا اپنا وار کر چُکا تھا۔ اُس کے چاروں ساتھی وار کر چُکے تھے۔ اب میری باری تھی۔ میں نے سارنگ بابا کو آواز دی:

”بابا جی! شانی کو لے آیئے۔“

سارنگ بابا آگے بڑھنے اور شانی کی گردن پکڑ کر بوڑھے سپیرے اور اُس کے چاروں ساتھیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے بِین پر وہی شانی والی دُھن بجانی شروع کی۔ میں کُچھ دیر تک شانی کے پاس کھڑے ہو کر بین بجاتا رہا اور پھر اُن سپیروں کے پیچھے جا کر بِین بجانے لگا۔ میں بِین بجا رہا تھا اور سارنگ بابا شانی کی گردن پکڑے اُن سپیروں کے سامنے کھڑے تھے۔ جیسے جیسے بِین کی لَے تیز ہوتی گئی، شان کی بے چینی بڑھتی گئی۔ پھر سارنگ بابا نے شانی کی گردن چھوڑ کر اُس کا مُنہ اُن سپیروں کی طرف کر دیا۔ شانی نے ایک خوفناک پھُنکار ماری۔ آگ کا ایک شُعلہ سا لپکا اور اُس نے بوڑھے سپیرے اور اُس کے چاروں ساتھیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک دم اُن کے جسم خُشک لکڑیوں کی طرح جلنے لگے۔

وہ چیختے ہوئے قریبی تالاب کی طرف بھاگنے کو تھے کہ سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر اُنہیں روک لیا اور بوڑھے سپیرے سے کہنے لگے۔ ”ٹھہرو! وہی حماقت مت کرو جو تمہارے بیٹے نے کی تھی۔ شانی کی لگائی ہوئی یہ آگ ایسی نہیں ہے جِسے

پانی بُجھا سکے۔ تُم پانی میں گئے تو پانی کے ساتھ ہی بھاپ بن کے اُڑ جاؤ گے۔"

سارنگ بابا نے فوراً اپنے تھیلے سے اُس سانپ کی راکھ نکالی جو رانی چمپا کے محل سے ہاتھ آیا تھا، اور اسے اُن سپیروں پر چھِڑک دیا۔ آگ اُسی وقت بُجھ گئی لیکن اُن کے جِسموں پر آگ کے اثر سے چھالے پڑ گئے تھے۔ سارنگ بابا نے ایک اور دوا نکالی اور اُن سب کے چھالوں پر لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹھیک گئے۔ سارنگ بابا بوڑھے سپیرے سے کہنے لگے:

"یہ دوا اِسی سانپ سے تیّار کی گئی ہے جو ہم نے سردار کی بیوی کے جسم سے نکالا تھا، اور جسے دیکھنے کے لیے تمہارے بیٹے نے ضِد کی تھی، اور ہمیں مداری، دھوکے باز اور نہ جانے کیا کیا کہا تھا۔"

بوڑھا پیرا اور اُس کے ساتھی سارنگ بابا کے قدموں پر گر پڑے۔ "ہمیں معاف کر دیجیئے مہاراج۔ ہمیں آپ کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اُن سے کہا۔ "سارنگ بابا کی طاقت ابھی تُم نے کہاں دیکھی

ہے۔ یہ تو انوشا نے تمھیں ذرا سا تماشا دکھایا تھا۔"

"ہم آپ کے بھی پاؤں پڑتے ہیں، انوشا جی۔" بوڑھا سپیرا اور اُس کے چاروں ساتھی بولے۔ "ہم سے بھُول ہوئی۔ ہمیں معاف کر دیجیے۔"

"جاؤ، اور شُکر کرو کہ سارنگ بابا اور انوشا نے تمھاری جان بخش دی ہے۔" یہ آواز سکندر کی تھی۔ وہ اور اُس کی بیوی، اُس کے افسر، راجا امبھی اور اُس کے درباری اور سپاہی اِس عجیب و غریب مُقابلے کو حیرانی اور دِلچسپی سے دیکھتے رہے تھے۔

اور پھر سکندر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمارے قریب آیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سارنگ بابا کے اور دوسرا میرے کندھے پر رکھا اور کہنے لگا:

"سارنگ بابا! تُم اور انوشا کے پاس وہ دولت ہے جو ہمارے پاس بھی نہیں۔ تمھارے پاس وہ عِلم ہے جو ہمارے اُستاد ارسطو کے پاس بھی نہیں تھا۔ مقدونیہ سے لے کر یہاں تک کی تمام دولت، تمام سونا چاندی، مال خزانے مل کر بھی

تمہارا انعام نہیں ہو سکتے۔ آج سے تُم دونوں ہمارے ساتھ رہو گے۔ ہمارے دوست، صلاح کار اور ساتھی بن کر رہو گے۔"

"اور اُوشا؟"

"اُوشا!" سکندر نے کہا۔ "وہ بھی تمہارے ساتھ رہے گی۔ ہم شِیش ناگ کی اِس بیٹی کا رقص دیکھنا چاہتے تھے لیکن اب بہت دیر ہو چُکی ہے۔ پھِر سہی۔"

رُخسانہ کا علاج

شاہی مہمان خانے سے راجا امبھی کے محل ہم کے اُس حصّے میں آ گئے جس میں سکندر کو ٹھہرایا گیا تھا۔ سکندر کی نظروں میں جو مرتبہ ہمیں حاصل ہوا تھا، وہ اِس سے پہلے کسی کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ راجا امبھی اور اُس کے درباری تو نوکروں کی طرح ہمارے قدموں میں بچھے جاتے تھے۔

مگر میرا دِل اِس عزّت افزائی سے کُچھ خوش نہ تھا اور اِس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمیں محل کے جِس کمرے میں جگہ ملی تھی، یہ وہی کمرا تھا جو کبھی راجا امبھی کی بڑی رانی یعنی میری ماں کا ہوا کرتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہی وہ کمرا تھا جہاں

میں نے جنم لیا تھا۔ میں راجا امبھی کا بڑا بیٹا تھا۔ امبھی میرا باپ تھا۔ لیکن نہ میں اُسے اپنا باپ کہہ سکتا تھا اور نہ اُسے معلوم تھا کہ اس کا بڑا بیٹا اس کے محل میں انوشا جوگی بن کر ٹھہرا ہوا ہے۔

اُوشا بھی اداس تھی، اِس لیے نہیں کہ اُسے جشن کے موقع پر اپنے جوہر دِکھانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ بلکہ اِس لیے کہ پُشکلاوتی کی تباہی کا جو منظر اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ اُس کے دِل اور دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

پُشکلاوتی کی تباہی کا اثر میرے دِل پر بھی اِسی طرح تھا جس طرح اُوشا کے دِل پر، بلکہ شِیش ناگ کی ہدایت نے اِس اثر کو اور گہرا کر دیا تھا۔ سکندر نے شِیش ناگ کے علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور اس کے جواب میں شِیش ناگ نے سُرخ ہیروں کا انمول تحفہ اُس کے دامن میں ڈال دیا تھا۔

شِیش ناگ کی یہ فراخ دِلی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پُشکلاوتی کی تباہی پر میرا دل بے چین تھا اور میں بے چین دِل کو مطمئن کرنے کے لیے کُچھ کرنا چاہتا

تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کُچھ کر سکتا، ایک ایسا واقعہ ہو گیا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ایک صُبح سکندر نے ہمیں اپنے پاس بُلایا۔ رات کے کِسی حصّے میں سکندر کی بیوی رُخسانہ کو ایک سانپ نے ڈس لیا تھا۔

اس صُبح سارنگ بابا بہت سویرے جاگ گئے تھے اور یُوں بیٹھے تھے جیسے اُنہیں کسی کی طرف سے بُلاوا آنے کا انتظار تھا۔ جب یہ بُلاوا آیا تو یہ صرف دونوں کے لیے تھا، لیکن سارنگ بابا نے اُوشا سے کہا:

"اُوشا، تُم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔"

ہم تینوں سکندر کی خدمت میں پہنچے۔ سارنگ بابا نے رُخسانہ کو دیکھا۔ اُس کا سارا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ وہ چند لمحے اس کا معائینہ کرتے رہے۔ پھر اُنہوں نے پلٹ کر اُوشا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اُوشا، امبر کہاں ہے؟"

اُوشا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی سارنگ بابا کے پاس آئی اور اُس نے اپنا پالتو

سانپ امبر سارنگ بابا طرف بڑھا دیا۔ ”یہ رہا، بابا جی۔“

سارنگ بابا نے امبر کو اُوشا کے ہاتھ سے لے لیا اور مُجھے قریب بُلایا۔ ”انوشا بیٹے، یہاں آؤ اور بِین بجاؤ۔“

میں نے بِین سنبھالی اور بجانے کے لیے ہونٹوں کی طرف لے گیا۔

”اِس کی دُھن یاد ہے نا؟“ سارنگ بابا نے پوچھا۔

”ہاں بابا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مہا تالی۔“

سارنگ بابا نے اب امبر سے مُخاطب ہو کر کہا۔ ”امبر! ابھی اور اِسی وقت رُخسانہ کے جسم سے سارا زہر نکال لو، ورنہ یاد رکھو ہم سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔“

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے امبر کا مُنہ رُخسانہ کی دائیں پنڈلی پر اُس جگہ لگا دیا جہاں سانپ کے ڈسنے کا نشان تھا۔ اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے مُجھے اِشارہ کیا اور میں بِین بجانے لگا۔

مہا تالی نے یہاں بھی وہی اثر دِکھایا جو ہم اِس سے پہلے اُس بستی میں دیکھ چکے تھے جہاں بنسری بجانے والے نوجوان کو ایک سانپ نے ڈس لیا تھا۔ جہاں مہا تالی کے اثر سے اُس نوجوان کی لاش میں زہر کھینچ کھینچ کر سانپ کے جسم میں پہنچنے لگا تھا اسی طرح یہاں بھی انسان کے جسم سے سانپ کا زہر امبر کے جسم میں پہنچنے لگا۔ جیسے جیسے رُخسانہ کے جسم سے زہر نکلتا گیا، اُس کی نیلاہٹ کم ہوتی گئی اور پھر بالکل ختم ہو گئی۔ امبر رُخسانہ کے جسم سے سارا زہر چُوس چُکا تو سارنگ بابا نے اُسے رُخسانہ کی پنڈلی سے ہٹا لیا اور پھر اُسے اُوشا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے:

”لو، اِسے واپس لے جاؤ۔ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“

اُوشا نے امبر کو سارنگ بابا کے ہاتھ سے لے لیا اور پھر سر جھکائے خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ اُوشا کا یہ رویّہ مُجھے پُر اسرار سا معلوم ہو رہا تھا۔

اُوشا کے چلے جانے کے بعد سارنگ بابا پھر رُخسانہ کی طرف متوجّہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے تھیلے سے وہی دوا نکالی جو بوڑھے سپیرے اور اُس کے ساتھیوں

کے چھالوں پر لگائی تھی اور جو اُس سانپ سے تیّار کی گئی تھی جسے ہم نے سردار کی بیوی کے جسم سے نکالا تھا۔ سارنگ بابا نے یہ دوا چُٹکی بھر لے کر رُخسانہ کی پنڈلی پر اُس جگہ اچھی طرح لگا دی جہاں سانپ کاٹے کے زخم کا نشان تھا اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

سکندر اُمّید بھری نظروں سے اپنی چہیتی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے اُس کے افسر اور اُن کے پیچھے امبھی اور اُس کے درباری کھڑے تھے۔ رُخسانہ کے ڈسے جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سب لوگ دِل سے اُس کی زندگی کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔

کُچھ دیر بعد رُخسانہ کے جسم میں حرکت ہوئی۔ سکندر فوراً اُس کی طرف بڑھا لیکن سارنگ بابا نے ہاتھ کے اِشارے سے اُسے روک دیا۔ سکندر وہیں رُک گیا لیکن اِس وقت اُس کے چہرے کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ کسی بادشاہ نے اپنی زندگی میں ایسی مجبوری اور لاچاری محسوس نہیں کی تھی۔ وہ رُک گیا اور وہیں کھڑا ہو کر رُخسانہ کی طرف دیکھنے لگا جس کے جسم میں آہستہ آہستہ زندگی کے آثار

ظاہر ہو رہے تھے۔

کُچھ دیر اور اِسی طرح گُزر گئی اور پھر رُخسانہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اپنے چاروں طرف یُوں دیکھ رہی تھی جیسے ابھی ابھی کسی ڈراؤنے خواب سے جاگی ہو۔

سارنگ بابا اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "اے سکندر! اب ہم چلتے ہیں۔"

سکندر نے آگے بڑھ کر سارنگ بابا کے ہاتھ تھام لیے اور کہنے لگا۔

"سارنگ بابا! میں اپنی زندگی دے کر بھی تمہارے اِس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ تُم نے رُخسانہ کو بچا کر مُجھے بچا لیا ہے۔"

سارنگ بابا نے بڑی نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھ سکندر کے ہاتھوں سے چھڑا لیے اور بولے:

"اے سکندر! اِس میں احسان کی کوئی بات نہیں۔ دیوتاؤں کی مرضی ہر حال میں

پوری ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر سارنگ بابا نے مُجھے آواز دی:

"انوشا بیٹے! آؤ، اب چلیں۔ اُوشا ہماری راہ دیکھ رہی ہو گی۔"

ہم باہر کی طرف بڑھے۔ سکندر کے افسروں نے ہمارے ہاتھ چومنے شروع کر دیے۔ یہ ہماری عزّت افزائی سے زیادہ سکندر کے ساتھ محبّت اور عقیدت کا اظہار تھا۔

ان کے بعد راجا امبھی آگے بڑھا اور اُس نے پہلے سارنگ بابا کے اور پھر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور کہنے لگا:

"مہاراج! آپ نے مُجھے شرمندگی سے بچا لیا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو میں کہیں کا نہ رہتا۔"

راجا امبھی کی یہ بات واقعی ٹھیک تھی۔ رُخسانہ کو کُچھ ہو جاتا تو امبھی اور اُس کے راج پاٹ کی خیر نہیں تھی۔

سکندر اور ناگ دیوتا

اُوشا ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پاتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن نظریں اُٹھا کر ہماری طرف نہیں لکھا۔ جہاں کھڑی تھی، سر جھکائے وہیں کھڑی رہی۔

سارنگ بابا نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا "شِیش ناگ کی بیٹی! جِسے خود شِیش ناگ نے معاف کر دیا ہے، تُجھے اُس سے بدلہ لینے کا کیا حق تھا؟ بول جواب دے! کیا تُجھے عِلم نہیں تھا؟ کیا تُو نے خُود اپنے ہاتھوں سے شِیش ناگ کی امانت سکندر کے حوالے نہیں کی تھی؟"

مُجھ سے بھُول ہوئی، مہاراج۔" اُوشا نے سارنگ کے پاؤں پکڑ لیے۔ "میری خطا

بخش دیجیے۔ شِیش ناگ کے نام پر مُجھے معاف کر دیجئے۔"

سارنگ بابا نے اُوشا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "شِیش ناگ نے سکندر کی طرح تُجھے بھی معاف کر دیا ہے، بیٹی۔ ایسا نہ ہوتا تو اِس وقت تُو یہاں زندہ نہ ہوتی، اور تیری لاش باہر میدان میں پڑی ہوتی۔"

اُوشا کو جھُرجھُری سی آ گئی۔ سارنگ بابا نے اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "تُجھے شُکر کرنا چاہیے کہ تُو ہماری پناہ میں ہے اور سکندر ہمیں اپنا دوست سمجھتا ہے۔"

میں یہ سب کُچھ سُن رہا تھا اور حیرانی سے اُوشا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پُشکلاوتی کی تباہی نے میرے دِل کو بے چین کر رکھا تھا اور میں اپنے بے چین دِل کو مطمئن کرنے کے لیے کُچھ کرنا چاہتا تھا کہ اُوشا مُجھ سے کہیں بڑھ کر چین تھی۔ میں صرف سوچتا ہی رہ گیا تھا اور اُس نے جرأت سے کام لے نشانہ پر وار کر ڈالا تھا۔

میں دِل ہی دِل میں اُوشا کی اِس دلیری پر عش عش کر رہا تھا، لیکن یہ سوچ کر مُجھے حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ اُوشا نے سکندر کی بیوی پر وار کیوں کیا؟ اُسے تو سکندر پر

وار کرنا چاہیے تھا جو امبر رُخسانہ کو ڈس سکتا تھا، اُس کے لیے سکندر کو ڈسنا کیا مُشکل تھا۔ میں نے سارنگ بابا سے کہا۔ ”بابا جی، پُشکلاوتی کی تباہی نے جِس طرح میرے دِل میں گھاؤ ڈالا تھا، اِسی طرح اُوشا کے دِل کو صدمہ پہنچایا تھا۔ اِس تباہی سے ہم دونوں کے دِل دُکھی اور بے چین تھے، اور ہم بے چینی کو دُور کرنے کی خاطر کُچھ کرنا چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ میں صرف سوچتا ہی رہ گیا اور اُوشا نے ہمّت کر کے رُخسانہ پر وار کر دیا۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اُوشا نے رُخسانہ پر وار کیوں کیا؟ ہمیں شکایت تو سکندر سے تھی۔ رُخسانہ نے ہمارا کیا بگاڑا تھا؟“

اُوشا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ”انوشا جی، میرے امبر نے پہلے سکندر کو ڈسا تھا اور پھر رُخسانہ کو۔ پر نہ جاتے کیا بات ہوئی کہ رُخسانہ کا بدن تو نیلا پڑ گیا اور سکندر کو کُچھ بھی نہ ہوا۔“

”اس لیے نہ ہوا کہ سکندر کی رگوں میں ناگ دیوتا کا خون ہے۔“ سارنگ بابا نے کہا۔

"کیا؟" ہم دونوں۔۔۔۔۔ اُوشا اور انوشا۔۔۔۔۔ کے مُنہ حیرت سے کھُل گئے۔
"سکندر کی رگوں میں ناگ دیوتا کا خُون ہے؟"

"ہاں۔" سارنگ بابا کہنے لگے۔ "اس کی ماں اولمپیاس دیونی سوس دیوتا کی داسی رہ چُکی ہے۔ سکندر کے باپ فیلقوس نے اُسے جزیرہ ساموتھریس میں اُس وقت دیکھا تھا جب وہ ایک چاندنی رات میں دوسری داسیوں اور پُجارنوں کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اُن داسیوں اور پُجارنوں کے اِرد گرد سینکڑوں ناگ زمین پر کُنڈلی مارے اور پھَن پھیلائے بیٹھے تھے۔ ہر داسی اور پُجارن کے بازوؤں اور ہاتھوں میں تھامی ہوئی مقدّس چھڑیوں سے کئی کئی سانپ لپٹے ہوئے تھے اور وہ اِن سانپوں کے ساتھ یُوں ناچ رہی تھیں جیسے اُن کے جِسموں میں بجلیاں بھری ہوں۔

یہ ناچ دیونی سوس دیوتا کے تہوار کے موقع پر ہوا تھا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور تیزی سے ناچتی ہوئی دیو داسیوں اور پُجارنوں کے اِرد ِگرد مشعلوں کی روشنیاں لہرا رہی تھیں۔ اِس موقع پر اولمپیاس کا رقص ایسا حیرت انگیز تھا کہ

دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ خود دیونی سوس دیوتا کی روح اولمپیاس کے جسم میں سما گئی ہے۔

اولمپیاس شہزادی تھی۔ اُس کا باپ نیوٹولیمس ریاست ایپی روس کا بادشاہ تھا لیکن اولمپیاس نے ایپی روس سے محلوں میں نہیں، ایپی روس کے جنگلوں میں سانپوں کے درمیان پرورش پائی تھی، اور دیونی سوس دیوتا کے حضور سینکڑوں سانپوں کے ساتھ ناچ اور عبادت کی پُراسرار رسموں نے اُسے لوگوں کی نظروں میں جادُوگرنی کی حیثیت دے رکھی تھی۔

وہ فیلقوس کی ملکہ بن کر محل میں آئی تو اُس کے پالتو سانپ اُس کے ساتھ تھے، اور یہ سانپ معمولی نہیں تھے۔ اُس کی خواب گاہ میں عِشقِ پیچاں کی بیلیں بھی تھیں اور مذہبی رقص کے لیے پنکھے بھی موجود رہتے تھے۔ اور بعض دفعہ اُس کے سانپ اُن بیلوں اور پنکھوں پر اچانک برآمد ہو جاتے تھے۔

جس رات اولمپیاس کے ہاں سکندر نے جنم لیا اُسی رات شہر ایپی روس میں جو

سمندر کے کنارے آباد ہے، آرٹمیس کے مندر میں آگ بھڑک اُٹھی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ یہ آگ آسمان سے نازل ہوئی تھی اور یہ لوگوں کی نظروں میں اِس بات کا شگُون تھا کہ اولمپیاس کا بیٹا آگے چل کر بہت شُہرت، عزّت اور عظمت حاصل کرے گا۔

وہ اگرچہ فیلقوس کا بیٹا تھا لیکن لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اصل میں زیوس دیوتا کا بیٹا ہے۔ یہ ساری باتیں صاف صاف اِس بات کی طرف اِشارہ کرتی ہیں کہ سکندر کی رگوں میں ناگ دیوتا کا خون ہے۔"

اتنا کہہ کر سارنگ بابا نے خاموشی اختیار کی۔ پھر وہ کہنے لگے:

"بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ ایک ناگن عورت کے روپ میں اُس کی بیوی بن کر رہ چکی ہے۔"

"ناگن!" میں نے حیرت سے کہا۔ "ایک ناگن سکندر کی بیوی رہ چکی ہے، یعنی سکندر نے ایک ناگن سے شادی کی تھی؟"

"ہاں۔" سارنگ بابا کہنے لگے۔ "یہ تب کی بات ہے جب سکندر ابھی اپنے وطن میں ہی تھا۔ ایک روز وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکار کے لیے گیا۔ ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا تو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ بہت دُور جا کر جب گھوڑا ایک جگہ رُکا تو سکندر گھوڑے سے نیچے اُترا اور دو گھڑی سستانے کے لیے ایک درخت کی طرف بڑھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان لڑکی درخت کے نیچے بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے۔

سکندر اُس لڑکی کے قریب گیا اور اُس سے پُوچھا: اے لڑکی! تُو کون ہے؟ اِس جنگل میں کیسے آئی اور تیرے رونے کا کیا سبب ہے؟

لڑکی نے جواب دیا اے نوجوان! میں آرمینیا کے بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ فارس (ایران) کے بادشاہ کے ساتھ ایک جنگ میں میرا باپ مارا گیا اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو شاہِ فارس نے قید کر لیا۔ میں قسمت کی ماری کِسی نہ کِسی طرح بچ نکلی اور اُس وقت سے جگہ جگہ ماری ماری پھرتی ہوں اور آج تقدیر مجُھے یہاں لے آئی ہے۔

سکندر نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ اب تُجھے یوں در در بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ میں سکندر ہوں۔ یونان کا بادشاہ۔ اب تُجھے یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی۔

سکندر دِل ہی دِل میں اُس لڑکی کو اپنی ملکہ بنانے کا فیصلہ کر چُکا تھا۔ اُس نے کہا آؤ، میرے ساتھ محل میں چلو۔ وہاں تُم میری ملکہ بن کر رہو گی؟

سکندر نے اُسے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا لیا اور واپس شہر کی طرف چلا۔ کُچھ ہی دیر بعد اُس کے ساتھی بھی اُس سے آ ملے۔ وہ سکندر کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے لیکن جب سکندر نے انہیں بتایا کہ یہ لڑکی اُس کی ہونے والی ملکہ ہے تو اُن کی حیرانی خوشی میں بدل گئی۔

سکندر اُس لڑکی کو اپنے ساتھ محل میں لے آیا جہاں نہایت دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہو گئی اور وہ لڑکی سکندر کی ملکہ بن گئی۔

مگر چند روز کے بعد ہی سکندر کو یُوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کا بدن گھُلتا جا رہا

ہے۔ اُس نے اپنے، استاد ارسطو سے اپنی حالت بیان کی۔ ارسطو نے سارے حالات کی چھان بین کی تو پتا چلا کہ سکندر کی ملکہ پانی کے پاس جانے سے گھبراتی ہے۔ اُس نے اپنے دِل میں ایک فیصلہ کیا اور سکندر کو ملکہ کے ساتھ دریا کی سیر کرنے پر آمادہ کر لیا۔

ملکہ کو اِس بات کا عِلم ہوا تو اُس نے دریا پر نہ جانے کے لیے کئی بہانے کیے، لیکن سکندر نے اصرار کیا تو خاموش ہو گئی۔ سکندر اپنی ملکہ، ارسطو اور دو خادموں کے ساتھ دریا پر پہنچا، جہاں شاہی بجرا اُن کے اِنتظار میں کھڑا تھا۔ وہ سب اُس میں سوار ہو گئے اور باتیں کرتے ہوئے دریا کی سیر کا لُطف اُٹھانے لگے۔ لیکن سکندر کی ملکہ خاموش تھی اور کُچھ اداس بھی دِکھائی دیتی تھی۔

جب شاہی بجرا دریا کے درمیان میں پہنچا تو ارسطو نے دونوں خادموں کو اشارہ کِیا اور اُنہوں نے ملکہ کو اچانک پانی میں دھکّا دے دیا۔ اِس کے ساتھ ہی ارسطو نے اپنی جیب سے ایک سفوف نِکالا اور اُس جگہ ڈال دیا جہاں ملکہ پانی میں گِری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملکہ پانی میں ڈوب گئی، لیکن پانی کی سطح پر سانپ کی دُم لہراتی نظر

آئی۔

سکندر کو اپنے اُستاد کی اِس حرکت پر بڑا غصّہ آیا لیکن ارسطو نے اُس سے کہا، اے سکندر! تیری ملکہ عورت نہ تھی، ایک ناگن تھی، جس نے عورت کا روپ دھار لیا تھا۔ پانی میں گرنے پر اُسے اپنے اصلی روپ میں آنا پڑا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ اُس دریا میں اُس جگہ پر اب بھی سانپ کی دُم لہراتی نظر آتی ہے جہاں ارسطو نے اُس ناگن کو ڈبویا تھا۔"

سارنگ بابا یہ واقعہ سُنا کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے:

"شِیش ناگ نے سکندر کو یونہی معاف نہیں کیا۔ کُچھ بات ہے تب ہی تو اُس نے اپنی انمول امانت سکندر کے دامن میں ڈال دی ہے اور وہ بات یہی ہے کہ سکندر کی رگوں میں نہ صرف ناگ دیوتا کا خُون ہے بلکہ ناگ دیوتا اُس پر مہربان بھی ہے۔ جب سکندر نے مِصر فتح کیا تو اُس نے آمون رع کا مندر دیکھنے کا ارادہ کیا، جسے مِصر والے نیل کا دیوتا کہتے ہیں۔ مِصر والوں نے بتایا کہ نیل کے دیوتا کا مندر

دریائے نیل کے کنارے نہیں۔ اُس سے بہت دُور پچھّم کی طرف صحرا میں ہے۔ سکندر نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا، اور جب اُسے بتایا گیا کہ وہاں تک کا سفر نہایت خطرناک ہے تو اُس کا نیل دیوتا کا مندر دیکھنے کا اِرادہ اور بھی پُختہ ہو گیا۔

سکندر نے صرف چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ مِصر کی فتح کے بعد سکندر نے اپنے نام پر شہر اسکندریہ بسانے کا حکم دیا تھا۔ سردیوں کے موسم میں سکندر نے اِس نئے شہر سے چل کر مغرب کی طرف کوئی ڈیڑھ سو کوس سفر کیا۔ پھر اُس نے بنجر صحرائی علاقے میں سے گُزرتے ہوئے جنوب کا رُخ کیا۔

اور پھر ایک جگہ وہ راستہ بھُول گئے۔ ہزار کوششوں کے باوجود سکندر کے رہبروں کو بھی پتا نہ چل سکا کہ گے کِس طرف کو جانا ہے۔ اِس موقع پر ناگ دیوتا نے سکندر کی مدد کی۔ اچانک ایک طرف سے دو ناگ نمودار ہوئے۔ اُنھوں نے سکندر کو نیل دیوتا کے مندر تک پہنچا دیا۔"

سارنگ بابا جب یہ واقعہ بیان کر رہے تھے تو میں اور اُوشا حیرت کی تصویر بنے اُن

کا مُنہ تک رہے تھے۔ اُنہوں نے سکندر کی زندگی کا ایک ایسا رُخ ہمارے سامنے رکھا تھا جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔

اب ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اُوشا کے پالتو سانپ امبر کے زہر کا اثر سکندر پر کیوں نہیں ہوا تھا اور شیش ناگ نے اپنی امانت سکندر کے دامن میں کیوں ڈال دی تھی۔

سکندر اور پورس کی جنگ

سکندر نے اُوشا کا رقص پھر کبھی دیکھنے کی بات کی تھی، لیکن وہ پھر کبھی نہ آیا۔
سکندر ٹیکسلا میں صرف ایک مہینا تھا اور پھر اپنی فوج کے ساتھ دریائے جہلم کی
طرف روانہ ہو گیا۔ راجا امبھی کے پانچ ہزار سوار اور پیارے بھی اُس کے ساتھ
تھے۔ اُن کو ملا کر سکندر کی فوج کی تعداد کوئی ایک لاکھ بیس ہزار ہو گئی تھی۔

راجا پورس کو سکندر کی تیّاریوں کی خبر مل چکی تھی اور وہ دریائے جہلم کے پار اپنی
فوج لیے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کی فوج دو سو ہاتھیوں، چار ہزار گھڑ سوار اور دو
سو جنگی رَتھوں کے علاوہ بیس ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

سکندر جہلم کے کنارے پہنچا تو برسات کا موسم شروع ہو چُکا تھا۔ دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا اور دریا کے پار ہر اُس مقام پر پورس نے فوج بِٹھا رکھی تھی جہاں سے دریا پار کیا جا سکتا تھا۔

سکندر نے مختلف جگہوں سے دریا پار کرنے کی کوشش کی، لیکن پورس کی فوجوں نے اُس کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اِس دوران میں سکندر نے پورس کر حیران کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ اپنی فوج کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے ہر طرف نقل و حرکت شروع کر دی تا کہ پورس کو یہ پتا نہ چل سکے کہ سکندر کیا کرنا جاتا ہے۔

سکندر پورس کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ سردیوں کے شروع ہونے کا انتظار کرے گا تا کہ جب دریا میں پانی کم ہو جائے تو اُس وقت اُسے پار کر کے پورس کے مُقابلے پر آئے۔

پھر ایک طوفانی رات میں سکندر اپنے سترہ ہزار سپاہی اور سواروں کو لے کر، پانی

کے بہاؤ کے خلاف اٹھارہ میل کا سفر کر کے ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہ تھا۔ اُس جگہ خُشکی کا ایک حصّہ پانی کے اندر کی طرف بڑھا ہوا تھا اور دریائے خم کھایا ہوا تھا۔ اِس کے علاوہ دریا کے درمیان میں ایک جزیرہ بنا ہوا تھا جس سے دریا کا پاٹ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

سکندر کی فوج ابھی اُس جگہ سے دریا پار کر ہی رہی تھی کہ پورس کو اُس کی خبر ہو گئی۔ اُس نے اپنے بڑے بیٹے کو دو ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ دے کر بھیجا تا کہ سکندر کی فوج کو دریا پار نہ کرنے دے۔ ان سپاہیوں کی کوششوں کے باوجود سکندر نے دریا پار کر لیا اور پورس کے دو ہزار کے دو ہزار سپاہی لڑتے ہوئے کام آئے۔

سکندر دریا پار کر کے پورس کی فوج کے پیچھے جا پہنچا۔ اِس اثنا میں اُس کی باقی فوج بھی دریا پار کر کے مُقابلے پر آ گئی۔ پورس کی فوج کے آگے ہاتھی تھے۔ اُن ہاتھیوں کو ایک خاص فاصلے پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اُن کے درمیان تیر انداز اپنی بھاری کمانیں لیے کھڑے تھے۔ اُن کی امداد کے لیے نیزوں اور تلواروں سے

مُسلّح سپاہی موجود تھے۔

جب دونوں فوجوں کا سامنا ہوا تو سکندر نے ایک چال چلی۔ وہ اپنے خاص رسالے کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ پورس کے رسالے نے اُس کا تعاقب کیا۔ سکندر کی فوج کے دوسرے دستے ایک لمبا چکّر کاٹ کر پورس کے گھُڑسواروں کے پیچھے جا پہنچے۔ اب سکندر کا رسالہ بھی پلٹ کر مُقابلے پر آ گیا اور اِس طرح سکندر کے گھُڑسواروں نے پورس کے رسالے کو دونوں طرف سے گھیرے میں لیا۔ پورس کے گھُڑسوار بے بس ہو کر رہ گئے۔ لیکن اِس کے باوجود بڑی مردانگی اور دلیری سے لڑتے رہے۔

سکندر کی پیادہ فوج پورس کے ہاتھیوں اور تیر اندازوں کے مُقابلے پر تھی۔ جب ہاتھیوں نے آگے بڑھنا شروع کیا اور سکندر کے بہت سے سپاہی اُن کے پیروں تلے کُچلے گئے، لیکن اِس کے باوجود اُنہوں نے جم کر مُقابلہ کیا اور ہاتھیوں کو روکے رکھا۔

پھر یُونانی سپاہیوں نے ہاتھیوں کے مہاوتوں کو مار ڈالا اور تلواروں اور نیزوں سے ہاتھیوں کو زخمی کر ڈالا۔ زخموں سے بِلبِلاتے ہوئے ہاتھی پلٹ پڑے اور اُنھوں نے اپنے آدمیوں کو روندنا شروع کر دیا۔

سکندر اپنے نامور گھوڑے بیوسی فالس پر سوار تھا اور دِل ہی دِل میں پورس کی بہادری کی تعریف کر رہا تھا۔ ایک بار وہ خود اُس کے نیزے کی زد میں آ گیا۔ پورس اپنا نیزہ تان کر سکندر کی طرف پھینکنے ہی والا تھا کہ سکندر کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر ِگرا اور ِگرتے ہی مر گیا۔ اِس کے ساتھ ہی سکندر بھی زمین پر ِگر پڑا۔ پورس نے وہیں اپنا ہاتھ روک لیا۔

”جس نے اپنی تلوار پھینک دی ہو، جو ِگر پڑا ہو، جو بھاگ رہا ہو، جو ہار مان چُکا ہو، جو بچّہ ہو، جو بُوڑھا ہو، جو عورت ہو، تُو اُس پر وار نہیں کرے گا۔“

کئی ہزار سال پہلے راجا شانتو کے بیٹے بھیشم نے یہ بات کہی تھی اور یہ بات ہر راجا، ہر سورما کے لیے ایک قسم کا درجہ رکھتی تھی۔

سکندر گر پڑا تھا اور گرے ہوئے دُشمن پر وار پورس کی شان کے خلاف تھا۔

پورس کا خیال تھا کہ سکندر نئے گھوڑے پر سوار ہر کر پھر اُس کے مُقابلے پر آئے گا لیکن سکندر کی روایات پورس کی روایات سے مختلف تھیں۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر پورس کے سامنے آنے کے بجائے اپنی پیادہ فوج کے پاس پہنچ گیا اور اُس کی نئے سِرے سے صف بندی کی۔

راجا پورس کے ہاتھی زخمی ہو کر خود اُس کی فوج میں تباہی اور افراتفری پھیلا رہے تھے۔ پھر سکندر کا گھڑسوار دستہ پورس کے رسالے کے مُقابلے میں کہیں زیادہ تیز تھا۔ سکندر کے سواروں کے گھوڑے پورس کے رسالے کے گھوڑوں کے مُقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر تھے، اور انھوں نے پورس کے رسالے کو شروع ہی میں اپنے گھیرے میں لے کر اُسے بے بس کر دیا تھا۔ پھر پورس کے تیر اندازوں کی کمانیں بہت بھاری تھیں اور اُنھیں تیر چلانے کے لیے اپنی کمانوں کے نِچلے سِرے زمین پر ٹکانے پڑتے تھے۔ بارش کی وجہ سے زمین گیلی ہو کر دلدل بن گئی تھی۔ اس لیے تیر اندازوں کی ساری مہارت بے کار ہو کر رہ گئی تھی۔

پورس کے جنگی رَتھ ہی ایسی چیز تھے جو جنگ کا پانسا پلٹ سکتے تھے لیکن زمین کے دلدل بن جانے کے باعث پورس کے دو سو جنگی رَتھ کیچڑ میں دھنس گئے۔ اِس کے مُقابلے میں سکندر کے گھُڑسوار اور سپاہی بڑی آسانی اور تیزی سے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ یہ ایک ایسی لڑائی تھی جس میں قُدرت سکندر کا ساتھ رہی تھی۔ دونوں فوجوں میں کوئی تین پہر تک گھمسان جنگ ہوتی رہی۔ پورس کی فوج کے پندرہ ہزار سپاہی مارے گئے اور نو ہزار قیدی بنا لیے گئے۔ اِس کے مُقابلے میں سکندر کی فوج کے صرف ایک ہزار سپاہی ہلاک ہوئے تھے۔ مرنے والوں میں پورس کے دو بیٹے بھی شامل تھے۔

قدرت نے اِس جنگ کا فیصلہ سکندر کے حق میں کر دیا تھا، لیکن پورس برابر میدانِ جنگ میں ڈٹا ہوا تھا اور شِکست تسلیم کرنے کے لیے تیّار نہیں تھا۔ وہ عزّت کے ساتھ جینا اور عزّت کے ساتھ ہی مرنا چاہتا تھا۔

سکندر پورس کو جنگ کے میدان میں دادِ شجاعت دیتے دیکھ چُکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ پورس اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہا ہے۔ وہ اُس کی بہادری اور شجاعت کا اُسی

وقت قائل ہو گیا تھا جب اُسے بیو سی فالس سے گرتے دیکھ کر پورس نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اب وہ دِل سے چاہتا تھا کہ کسی طرح پورس کی جان بچ جائے۔

جنگ کے میدان سے ہٹنے والوں میں پورس سب سے آخری شخص تھا۔ اُس کا بایاں کندھا زخمی ہو گیا تھا اور اُس سے خون بہہ رہا تھا۔ اِس کے باوجود وہ لڑتا رہا۔ اُس نے واپس ہونے کے لیے اپنے ہاتھی کا رُخ اُس وقت موڑا جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ سکندر کے مُقابلے میں جنگ ہار چُکا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی پورس کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ سکندر کے کِسی افسر یا سپاہی کو اُس کے قریب جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ ہار چُکا تھا لیکن ہارنے کے باوجود ذلّت کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔

سکندر نے راجا پورس کو جاتے دیکھا تو امبھی کو بھیجا کہ وہ پورس کو ہتھیار ڈالنے پر راضی کر لے۔ سکندر نے اُس کام کے لیے سب سے زیادہ غَلَط آدمی چُنا تھا۔ امبھی تو پورس کا جانی دُشمن تھا۔ یہ لڑائی اِسی دُشمنی کے باعث ہوئی تھی۔ اِسی کے باعث اُس کے دو بیٹے مارے گئے تھے، پندرہ ہزار سپاہی کھیت تھے اور نو ہزار

سپاہی سکندر کی قید میں چلے گئے تھے۔

ابھی سکندر کا حکم سُنتے ہی اپنا گھوڑا دوڑاتا پورس کی طرف گیا اور اُسے آواز دی:

"پورس!"

اپنے پُرانے دُشمن امبھی کی آواز کان میں پڑتے ہی راجا پورس پلٹا اور اُس پر نیزے کا وار کیا۔ اگر امبھی گھوڑا ایک طرف نہ کر لیتا تو پورس کا نیزہ اُس کا کام تمام کر گیا تھا۔ اس واقعے نے سکندر کے دِل پر اور بھی اثر کیا۔ اُس کے سامنے ایک ایسا دلیر اور غیرت مند دُشمن تھا جو اپنی زندگی کے آخری سانس تک بھی شکست قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی بہادری، ایسی غیرت قابلِ داد تھی۔

سکندر نے راجا امبھی کے بعد اور کئی لوگوں کو پورس کی طرف بھیجا کہ اُسے اِس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ اپنے آپ کو سکندر کے حوالے کر دے۔ اُن لوگوں میں کئی ایسے افسر اور کئی ایسے تھے جنھیں پورس کے دوست کہا جا سکتا تھا۔ لیکن دلیر اور غیرت مند پورس نے صاف انکار کر دیا۔ اُسے عزّت کی موت منظور

تھی۔ ذلّت کی زندگی قبول نہ تھی۔

آخر سکندر نے سارنگ بابا کو پورس کی طرف بھیجا۔ وہ اکیلے اور نہتے اُس کے پاس گئے اور اُسے آواز دی۔ ”مہاراج!“

سارنگ بابا کی آواز سُن کر راجا پورس چونکا۔ اُس نے ہاتھی کو روکا اور پلٹ کر سارنگ بابا کی طرف رُخ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ میں سارنگ مہاراج کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں یا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟“

”آپ کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں، مہاراج۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”یہ سارنگ بابا ہی ہے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔“

”پر مہاراج، آپ یہاں کہاں؟“

”مُجھے سکندر نے بھیجا ہے۔۔۔۔“

”آپ کو سکندر نے بھیجا ہے؟“ پورس نے سارنگ بابا کی بات کاٹ کر کہا۔ ”کیا

آپ نے بھی امبھی کی طرح سکندر کی غلامی کا جُوا اپنی گردن پر رکھ لیا ہے؟"

"نہیں، مہاراج۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "ہم جوگی اور سنیاسی کسی سکندر کی غلامی قبول نہیں کرتے۔ یہ تو سکندر ہے جو وقت پڑنے پر جوگیوں اور سنیاسیوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔"

"تو پھِر آپ یہاں کیسے آئے؟" پورس نے پوچھا۔

"ٹیکسلا میں سکندر کی بیوی کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ ہم نے اُس کا علاج کیا۔ تب سے ہم تینوں، میں، انوشا اور اُوشا، سکندر کے ساتھ ہیں۔ اُس کے مہمان بن کر نہیں، بلکہ اُس کے دوست، ساتھی اور صلاح کار بن کر۔"

"تب تو آپ نے سکندر کو بہت سے مشورے دیے ہوں گے۔" پورس نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "شاید یہ لڑائی بھی آپ ہی کے مشورے سے ہوئی ہو گی۔"

"پورس مہاراج!" سارنگ بابا نے کہا۔ "آپ نے یہ بات کیسے کہہ دی؟ آپ

سارنگ بابا کو اتنا ہی گِرا ہوا سمجھتے ہیں؟ میں نے ایک بار آپ کے دربار میں جو بات کہی تھی، وہی اب بھی کہتا ہوں۔ آپ تو اِس دھرتی کی آبرو ہیں۔ آپ ایسے مہاراجا ہیں جنہیں دُنیا والے رہتی دنیا تک یاد رکھتے ہیں۔ لڑائی میں ہار جیت قسمت کی بات ہے لیکن اِس ہار کے باوجود سکندر کے دِل میں آپ کی وہ عزّت ہے جو اپنے کسی بڑے سے بڑے افسر کی بھی نہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ مقدونیہ سے یہاں تک اُس نے آپ جیسا دلیر اور غیرت مند راجا کوئی نہیں دیکھا۔ اِسی لیے وہ آپ سے مِلنا چاہتا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں آپ کو لینے آیا ہوں، مہاراج۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "اِس لیے نہیں کہ آپ سکندر کی اِطاعت قبول کریں، بلکہ اِس لیے کہ سکندر خود آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اور دِل سے آپ کی عزّت کرتا ہے۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں کہ آپ کی اور سکندر کی ملاقات اِس حالت میں ہو رہی ہے کہ سکندر کی جیت ہوئی ہے اور آپ کی ہار، مگر بات یہ ہے کہ بہادر اور غیرت مند ہار کر بھی بہادر اور غیرت مند

رہتا ہے اور اُس کا دُشمن جیت کر بھی اُس کی بہادری اور غیرت کو سلام کرتا ہے۔"

سارنگ بابا کی یہ باتیں سُن کر پورس نے اپنے ہاتھی کو بِٹھایا اور ہاتھی سے اُتر کے سکندر کا انتظار کرنے لگا۔

سکندر راجا پورس کے نزدیک پہنچ کر گھوڑے سے اُتر گیا۔ پورس کے ڈیل ڈول اور اُس کے رعب دار چہرے نے اُسے پہلے ہی بہت متاثر کر رکھا تھا۔ اب جو اُس نے اُسے قریب سے دیکھا تو اور بھی زیادہ متاثر ہوا۔

راجا پورس سکندر کے مُقابلے میں ہار چُکا تھا۔ اُس کا بایاں کندھا زخمی تھا مگر اِس ہار اور زخم کے باوجود پورس کا چہرہ پہلے کی طرح باوقار اور بارُعب تھا۔ شکست کا کوئی اثر اُس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا حوصلے والا راجا سکندر نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

سکندر کے حکم پر پہلے راجا پورس کو پانی کا گلاس پیش کیا گیا اور جب وہ پانی پی چُکا تو

سکندر نے اُس سے پوچھا:

"بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" اور اُس کے جواب میں پورس نے سر جھکا کر نہیں، سر اُٹھا کر جواب دیا:

"جیسا سلوک بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"بالکل بجا۔" سکندر نے کہا۔ "لیکن تُم خود کیا چاہتے ہو؟"

پورس نے جواب دیا۔ "میرے پہلے جواب میں سب کُچھ آ گیا ہے۔"

پورس کا دلیرانہ جواب سکندر کے ساتھیوں کے لیے حیرانی کا باعث تھا۔ لیکن خود سکندر کے لیے نہیں۔ وہ تو اس جواب سے اِتنا خوش ہوا کہ اُس نے پورس کی ساری سلطنت اُسے واپس کر دی۔ صرف یہی نہیں، کُچھ اور علاقے بھی اُسے بخش دیے جو اُس کی اپنی ریاست سے بھی کہیں بڑے تھے۔ سکندر بہادر تھا، اور بہادر ہی بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔

یہ وہ پورس تھا جِس نے ہار کر بھی اپنا سر اُونچا رکھا تھا اور ایک امبھی، میرا باپ، تھا جِس نے پورس کی دُشمنی کی خاطر اپنا سب کُچھ سکندر کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ لیکن سکندر کی نظروں میں راجا پورس کی قدر امبھی سے زیادہ تھی۔ راجا پورس کے ساتھ لڑائی میں سکندر کے صرف ایک ہزار سپاہی ہلاک ہوئے تھے، لیکن اُن ایک ہزار سپاہیوں سے زیادہ اُسے اپنے گھوڑے بیوسی فالس کے مرنے کا افسوس تھا جو اِس لڑائی میں کام آیا تھا۔

سکندر نے کتنے ہی گھوڑوں کی سواری کی تھی لیکن بیوسی فالس وہ گھوڑا تھا جِسے شاید قدرت نے خاص سکندر کے لیے بنایا تھا۔ جِن دِنوں سکندر صرف ایک لڑکا تھا، اُس وقت تسلّی کا ایک سوداگر اُس گھوڑے کو فروخت کرنے کے لیے شاہ فیلقوس (فلپ) کے پاس لایا تھا اور اُس سوداگر نے اُس گھوڑے کی بڑی بھاری قیمت لگائی تھی۔

فیلقوس سکندر کو ساتھ لے کر یہ گھوڑا دیکھنے کے لیے میدان میں آیا۔ گھوڑا اِس طرح اُچھل کُود رہا تھا جیسے باگیں چھڑا کر بھاگ جانے کے لیے بے تاب ہو۔ صُبح

کے سورج کی روشنی میں اُس کا سیاہ رنگ چمک رہا تھا اور اُس کے ماتھے پر سفید رنگ کی ایک روشن لکیر تھی۔ اس کا ہاڑ چوڑا چکلا اور سر بھاری تھا۔

شاہی سائیسوں نے اُس کی چال دیکھنا چاہی تو وہ دو چار چکّر لگا کر دولتّیاں مارنے لگا۔ جب بھی کسی نے سوار ہونے کی نیّت سے اُس کے قریب آنے کی کوشش کی تو وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک آدمی اُچک کر اُس پر سوار ہوا تو وہ ایک دم یُوں اُچھلا کہ سوار دھم سے زمین پر آ گرا۔

فیلقوس یہ دیکھ کر بد دِل سا ہو گیا اور اُس نے سوداگر سے کہا کہ وہ اپنا گھوڑا واپس لے جائے۔ سکندر پاس کھڑا تھا۔ اُس نے گھوڑے کو واپس جاتے دیکھا تو چلّا اُٹھا:

"ٹھہرو! ورنہ پچھتاؤ گے!"

سکندر کے یہ الفاظ سُن کر اُس کا باپ فیلقوس غصّے سے کہنے لگا۔ "کیا تُم یہ سمجھتے ہو کہ تُم میرے سائیسوں سے زیادہ قابل ہو؟"

سکندر نے بڑے جوش سے کہا۔ "ہاں، میں اِس گھوڑے کو قابو میں لا سکتا ہوں۔

اِس پر سواری کر سکتا ہوں۔"

باپ اور بیٹے ہیں شرط لگ گئی۔ فیلقوس نے کہا۔"اگر تُم نے اِس گھوڑے کو رام کر لیا تو یہ تمہارا ہو جائے گا۔"

سکندر یہ سُنتے ہی گھوڑے کی طرف دوڑ پڑا۔ اُس نے گھوڑے کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اُس کا مُنہ سُورج کی طرف کر دیا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ گھوڑا اپنے سائے اور دوسرے لوگوں کے سایوں کو دیکھ کر بِدکتا ہے۔ اُس نے اُس کا مُنہ سُورج کی طرف کیا تو وہ چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ سکندر کُچھ دیر گھوڑے کو آہستہ آہستہ تھکاتا رہا اور پھر اُچک کر اُس پر سوار ہو گیا۔

وہ اُس گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں چند سو گز ہی گیا تھا کہ اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس نے بازی جیت لی ہے اور یہ گھوڑا اُس کا ہو چُکا ہے۔

گھوڑے کو دوڑانے کے بعد سکندر واپس اپنے باپ کے سامنے آیا تو فیلقوس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اُس نے سکندر کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہنے

لگا:

”میرے بیٹے! تُجھے اپنے لیے کوئی بڑی سلطنت تلاش کرنی پڑے گی۔ مقدونیہ کی چھوٹی سی ریاست تیرے لیے کافی نہیں ہے۔“

اور تب سے سکندر نے ہر مقام پر، ہر سفر میں، ہر جنگ میں، اِسی گھوڑے بیوسی فالس پر سواری کی تھی اور یہ بیوسی فالس، جو ایک طرح سے اُس کی زندگی کا ساتھی بن گیا تھا، اب دریائے جہلم کے کنارے اُس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

سکندر نے اُس عزیز گھوڑے کی یاد میں دریائے جہلم کے اُس مقام پر شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا جہاں سے وہ دریا پار کر کے پورس کے مُقابلے پر آیا تھا۔ اُس شہر کا نام اُس نے گھوڑے کے نام پر بیوسی فالس رکھا۔

راجا سوبھوتی کے کُتّے

لیکن مہاراجا پورس کے ہاں چند روز قیام کرنے کے بعد سکندر اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔ دریائے چناب پار کر کے جب وہ سیالکوٹ پہنچا تو وہاں کے راجا نے فوراً ہی اُس کی اِطاعت قبول کر لی۔

لیکن جب سکندر نے راوی عبور کیا تو سانگلا کا کاتھی راجا خم ٹھُونک کر اُس کے مُقابلے پر آ گیا، سانگلا ایک چھوٹی سی ریاست تھی لیکن کاتھیوں کو اپنی بہادُری اور خُوب صُورتی پر ناز تھا اور یہ ناز کُچھ بے جا نہیں تھا۔

یُونان کی ریاست سپارٹا اپنے بہادروں اور پہلوانوں کے لیے مشہور تھی۔ وہاں پر

ہر بچّہ پیدا ہوتے ہی ایک دِن بات کے لیے مُقدّس پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا جاتا تھا اور وہی بچّہ زندہ رہ کر پرورش پاتا تھا جس کی زندگی دیوتاؤں کو منظور ہوتی تھی۔ اور جب یہ بچّے بڑے ہو کر مرد بنتے تھے تو دلیری اور بہادری میں اپنا جواب آپ ہوتے تھے۔ مگر کاتھیوں کی ریاست اِس معاملے میں سپارٹا سے بھی چند قدم آگے تھی۔ یہاں صرف وہی بچّے پالے جاتے تھے جو خُوب صُورت اور تندرست ہوتے تھے، ہر بچّہ پیدائش کے دو ماہ بعد ریاست کی طرف سے مقرّر کیے ہوئے پنچوں کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ وہ بڑے غور سے اُس کا معائنہ کرتے تھے کہ یہ بچّہ خُوب صُورتی اور تندرستی کے لحاظ سے اُس معیار کے مطابق ہے یا نہیں جو راجا کی طرف سے مقرّر کیا گیا تھا اور اُسے زندہ رہنا چاہیے یا نہیں۔ اِس کے بعد بد شکل، اپاہج اور لنگڑے لولے، اندھے بچّوں کو مار دیا جاتا تھا۔ جو بچّے زندہ رہتے تھے، اُن کی پرورش کا پورا پورا بندوبست کیا جاتا تھا۔ جب وہ بڑے ہو جاتے تھے تو لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں بھی خُوب صُورتی میں اپنا جواب آپ ہونے کے ساتھ ساتھ جرأت اور شُجاعت میں مردوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔

اِسی لیے ایک چھوٹی سی ریاست کا مالک ہونے کے باوجود کاتھی راجا خم ٹھونک کر سکندر کے مُقابلے میں آ گیا۔ کاتھی کم تعداد کے باوجود ایسی بے جگری سے لڑے کہ سکندر کے سپاہی پورس کے ساتھ اُس جنگ کو بھُول گئے جو دریائے جہلم کے کنارے ہوئی تھی۔ اس جنگ میں سکندر کے بارہ سو سپاہی بُری طرح زخمی ہوئے۔ کاتھی اگرچہ بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے، لیکن آخر کار سکندر اُن پر غالب آیا۔ اُس نے سانگلا کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اُس کے سترہ ہزار سپاہیوں کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا اور یُوں سکندر کے ہاتھوں کاتھیوں کی وہ ریاست اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ ختم ہو گئی جسے اپنے باشندوں کی خُوب صُورتی اور جنگی مہارت پر ناز تھا۔

سکندر اِس سے پہلے اشواک قبیلے اور پشکلاوتی کے شہر کو اِسی طرح تباہ و برباد کر چُکا تھا۔ لیکن کاتھیوں کی تباہی ایسی خوف ناک تھی کہ پھِر کِسی کو اُس کے مُقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ کشمیر کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ قلعوں پر قلعے، شہروں پر شہر فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

پھر وہ راجا سوبھوتی کے شہر میں داخل ہوا۔ سوبھوتی نے اُس کا اُسی طرح اِستقبال کیا جس طرح راجا امبھی نے ٹیکسلا میں کیا تھا۔ راجا امبھی نے تو پورس کی دُشمنی کی خاطر سکندر کا خیر مقدم کیا تھا لیکن راجا سوبھوتی کی ایسی کوئی غرض نہ تھی۔ اُس کا سامنا ایسے کِسی دُشمن سے نہ تھا جس کے لیے اُسے سکندر کے سہارے کی ضرورت ہوتی۔

سکندر راجا سوبھوتی سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ امبھی اور پورس کے پاس ہاتھی، گھوڑے اور جنگی رَتھ تھے جن پر اُنہیں بڑا ناز تھا، مگر راجا سوبھوتی کو نہ اپنے ہاتھیوں پر ناز تھا اور نہ اپنے گھوڑوں اور جنگی رَتھوں پر۔ اُسے اگر ناز تھا تو اپنے کُتّوں پر۔ اور یہ کُتّے دو چار یا دس بیس نہیں، سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ راجا سوبھوتی کے پاس کُتّوں کی اچھّی خاصی فوج تھی۔ اِس فوج میں ہر رنگ اور ہر نسل کا کُتّا موجود تھا۔

سکندر اِن رنگ برنگ اور نسل نسل کے کُتّوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اتنی تعداد میں کُتّے اُس نے اب تک نہیں دیکھے تھے۔

”یہ اِتنے کُتّے تُم نے کاہے کے لیے جمع کر رکھے ہیں؟“ اُس نے راجا سوبھوتی سے پوچھا۔

”لڑائی کے لیے۔“ راجا سوبھوتی نے جواب دیا۔

”لڑائی کے لیے؟“ سکندر حیران رہ گیا۔

”ہاں مہاراج۔“ سوبھوتی نے کہا، ”دوسرے راجا ہاتھیوں اور گھوڑوں کی مدد سے لڑائی لڑتے ہیں، جنگی رَتھوں پر بیٹھ کر جنگ کے میدان میں آتے ہیں۔ میں ہاتھی، گھوڑے اور جنگی رَتھوں کے ساتھ ساتھ اُن کُتّوں کو لے کر جنگ کے میدان میں جاتا ہوں۔“

”جنگ کے میدان میں یہ کُتّے کیا کرتے ہیں؟“

”ہاتھیوں سے لڑتے ہیں، گھوڑوں کا مُقابلہ کرتے ہیں۔“ سکندر کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے جیسے سوبھوتی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے کہا:

”یہ کُتّے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا مُقابلہ کرتے ہیں؟“

سوبھوتی نے جواب دیا۔ ”خُونی سے خُونی ہاتھی اِن کے آگے بے بس ہو جاتا ہے اور تیز سے تیز گھوڑے کو بھی یہ اپنے گھیرے سے نہیں نکلنے دیتے۔ کئی سال پہلے کی بات ہے، سیال کوٹ والوں سے میری لڑائی ہوئی تھی تو میں نے اِن کُتّوں کے بَل پر ہی میدان مارا تھا۔ وہ دِن اور آج کا دِن، پھِر کِسی چھوٹے بڑے راجا نے مُجھ سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی۔“

سکندر کو یہ سب کُچھ ناقابلِ یقین معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”میں اِن کُتّوں اور گھوڑوں کا مُقابلہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اِس کا بندوبست ہو جائے گا، مہاراج۔“ راجا سوبھوتی نے کہا۔ ”لیکن اس وقت نہیں، کل کے جشن میں۔ اس جشن میں آپ اور بہت کُچھ دیکھیں گے۔“

راجا سوبھوتی نے سکندر کے اعزاز میں جِس جشن کا بندوبست کیا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ یُوں تو اِس میں راجا پورس والے جشن کی طرح ناچنے والی ٹولیاں بھی

تھیں اور راجا امبھی کے جشن کی طرح بازی گر اور جادُو گر بھی، لیکن راجا سوبھوتی کے کُتّوں نے اِس جشن میں جو کمالات دِکھائے وہ اُن سب پر بھاری تھے۔

پہلے تو اِن کُتّوں نے بازی گروں کی طرح کرتب دِکھائے اور پھر میدان میں دو ہاتھی لاکر چند کُتّے اُن کے مُقابلے میں چھوڑے گئے۔ کُتّوں نے ہاتھیوں کے گرد چکّر کاٹتے اور بھونکتے ہوئے یُوں اُچھل اُچھل کر اُنہیں کاٹا کہ ہاتھی پریشان ہو گئے اور چنگھاڑتے ہوئے میدان سے بھاگ نکلے۔

ہاتھیوں کے بعد گھوڑے میدان میں لائے گئے تو اُن کا بھی کُتّوں نے یہی حال کیا۔ سکندر دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں، اب بھی اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔ جب کُتّوں نے گھوڑوں کو زِچ کر دیا اور وہ میدان سے ہٹا لیے گئے تو سکندر نے سوبھوتی سے کہا:

"اب میرے لشکر کے گھوڑے اِن کا مُقابلہ کریں گے۔" راجا سوبھوتی نے سکندر

کی طرف یوں دیکھا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مہاراج۔"

"تمہارے کُتّوں کا مُقابلہ میرے گھوڑوں سے ہو گا۔"

یہ کہہ کر سکندر نے اپنے ایک افسر کو اِشارہ کیا۔ ذرا سی دیر بعد سکندر کے پانچ گھُڑ سوار میدان میں آ گئے۔ ہر سوار اپنے بدن پر ہتھیار سجائے ہوئے تھا۔ سکندر نے رانا سو بھوتی سے کہا:

"اپنے کُتّوں کو اُن کے مقابلے پر لاؤ!"

راجا سو بھوتی ہچکچایا تو سکندر نے کہا۔ "گھبرا کیوں رہے ہو؟ اگر اِن میں سے کوئی مارا بھی گیا تو اُس کا خُون تمہاری گردن پر نہ ہو گا۔ ہم یونان والے خُونی تماشوں کے عادی ہیں۔"

سکندر کے اِصرار پر راجا سو بھوتی نے اپنے کُتّے سکندر کے سواروں کے مُقابلے پر

چھوڑ دیے اور اُس کے ساتھ ہی جشن کا میدان، میدانِ جنگ بن گیا۔ کُتّوں کے بھونکے، گھوڑوں کے ہنہنانے اور گھُڑ سواروں کے نعروں اور چیخوں نے بڑے بڑے بہادروں کے دِل ہلا دیے۔ گھُڑ سوار نیزوں سے کُتّوں پر وار کرنے کی کوشش کر رہے تھے، گھوڑے کُتّوں پر دولتّیاں جھاڑ رہے تھے اور اِس حالت میں سواروں کا اپنے آپ کو سنبھالنا مُشکل ہو رہا تھا۔ اور کُتّے تھے کہ بھونک بھونک کر اور اُچھل اُچھل کر گھوڑوں اور گھُڑ سواروں کو کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اور جب جنگ ختم ہوئی تو میدان راجا سوبھوتی کے کُتّوں کے ہاتھ رہا۔ پانچوں گھُڑ سوار زمین پر زخمی ہوئے پڑے تھے اور گھوڑے اپنے سواروں کو پھینک کر بھاگ گئے تھے۔

راجا سوبھوتی کے کُتّوں نے سکندر کے گھُڑ سواروں کو زخمی کر دیا تھا، اُن کے گھوڑوں کو بھگا دیا تھا لیکن سکندر اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جِن میں راجا سوبھوتی کے لیے تعریف ہی تعریف تھی۔ یہ وہ راجا تھا جِس نے کُتّوں کو ایک خوفناک جنگی ہتھیار بنا دیا تھا اور اِس کے باوجود پورس کی طرح یا کاتھی راجا

کی طرح اُس کے مُقابلے پر نہیں آیا تھا اور نہ ہی اُس نے راجا امبھی کی طرح اپنے کسی دُشمن کو نیچا دِکھانے کی خاطر سکندر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔

جشن ختم ہو چُکا تھا، راجا سوبھوتی نے اپنے کُتّوں کو زنجیروں سے بندھوا دیا تھا اور گھُڑسواروں کے زخموں کی مرہم پٹّی کی جارہی تھی کہ سیلوکس سکندر کے پاس آیا اور آداب کر کے کہنے لگا۔ ”

میں نے آپ کے حکم کے مطابق چند جاسوسوں کو ستلج پار کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ واپس آ گئے ہیں۔ “

”وہ کیا کہتے ہیں؟“ سکندر نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ کہتے ہیں کہ دریائے ستلج کے پار نند خاندان کے راجا سُدھانند کی حکومت ہے، جو گنگا کی وادی سے آگے مشرقی سمندر تک پھیلی ہوئی ہے۔ اُس کی فوج میں چھ ہزار ہاتھی، آٹھ ہزار جنگی رَتھ، اسّی ہزار گھُڑسوار اور دو لاکھ پیادہ سپاہی ہیں۔ یہ راجا گنگا کے کنارے، شہر پاٹلی پُتر میں رہتا ہے اور اُس کے خزانے سونے

چاندی سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ اُس کی سلطنت مگدھ کے نام سے مشہور ہے۔"

سکندر نے یہ سب کُچھ سُن کر کہا۔ "کل ہم آگے روانہ ہوں گے۔"

اور اگلے ہی دِن سکندر اپنی فوج کے ساتھ، دریائے بیاس کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیاس کے کنارے

سکندر جب بیاس کے کنارے پہنچا تو اُس کی فوج کا ایک ایک افسر، ایک ایک سپاہی، نند خاندان کی اِس عظیم سلطنت کے متعلّق جان چُکا تھا جو دریائے ستلج کے کنارے سے شروع ہو کر مشرق میں سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُن، کو یہ عِلم ہو چُکا تھا کہ اِس سلطنت کے راجا کے پاس چھ ہزار ہاتھی، آٹھ ہزار جنگی رَتھ، اسّی ہزار گھُڑسوار اور دو لاکھ سپاہی ہیں۔

دریائے جہلم سے دریائے بیاس تک سکندر نے اڑتیس پہاڑی شہروں اور قلعوں پر قبضہ جمایا تھا۔ اب کُچھ فاصلے پر مگدھ کی وہ سلطنت تھی جو مشرقی سمندر تک

پھیلی ہوئی تھی۔ سکندر اِس کو فتح کر کے مشرقی سمندر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگدھ کی فوجی طاقت اُس کی نظروں میں کوئی اہمیّت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اب تک ایک تند و تیز طوفان کی طرح اپنے راستے میں آنے والی ہر طاقت، ہر رکاوٹ کو ملیا میٹ کرتا آیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ مگدھ کا راجا اپنے سونے چاندی سے بھرے ہوئے خزانوں، چھ ہزار ہاتھیوں، آٹھ ہزار جنگی رَتھوں، اسّی ہزار گھوڑوں اور دو لاکھ سپاہیوں کے باوجود اُس کا راستہ نہیں روک سکے گا۔

لیکن سکندر کے افسر اور سپاہی کُچھ اور سوچ رہے تھے۔ اُنہیں گھروں سے نکلے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے اور وہ اپنے وطن سے بارہ ہزار میل دُور آ چُکے تھے۔ پے در پے جنگوں نے اُنہیں تھکا دیا تھا۔ راجا پورس اور کاتھی راجا کے ساتھ اُنہیں جو لڑائیاں لڑنی پڑی انہوں نے اُن کی جان نکال لی تھی اور اب لڑائی کے تصوّر ہی سے اُنہیں خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پورس اور کاتھی راجا کی ریاستیں تو چھوٹی چھوٹی تھیں اور اُن چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے ڈٹ کر مُقابلہ کیا تھا۔ جب یہ چھوٹی ریاستیں اتنی مشکل سے فتح ہوئی تھیں تو اِس سلطنت کے ساتھ مُقابلے میں اُن کا

کیا حال ہو گا جو اُن سے کہیں بڑی ہے! جس کے پاس آٹھ ہزار جنگی رَتھ ہیں، چھ ہزار ہاتھی ہیں، اسّی ہزار گھڑ سوار ہیں اور دو لاکھ سپاہی ہیں۔ اُنہیں یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سکندر انہیں موت کے مُنہ میں لے جا رہا ہے۔ پس اُنہوں نے آگے جانے سے اِنکار کر دیا۔ وہ موت کے مُنہ میں نہیں، اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتے تھے۔

سکندر کے سپاہیوں نے پہلی بار آگے جانے سے اِنکار نہیں کیا تھا۔ فارس (ایران) کی فتح کے بعد بھی اُنہوں نے اِسی طرح آگے جانے سے اِنکار کر دیا تھا اور واپس مقدونیہ جانے کے لیے ضِد کی تھی لیکن اُس وقت سکندر نے انہیں احساس دِلایا تھا کہ ابھی فارس کے بہت سے علاقے فتح ہونا باقی ہیں اور اگر وہ اپنے فتح کیے ہوئے علاقوں میں مضبوطی سے قدم جمائے بغیر واپس چلے گئے تو مشرق کے لوگ اُنہیں اور اُن کے کارناموں کو خواب کی طرح بھُول جائیں گے۔

سکندر کی اُس جوشیلی تقریر نے سپاہیوں کے دِلوں کو گرما دیا تھا اور وہ گھر واپس جانے کا خیال چھوڑ کر سکندر کے ساتھ آگے بڑھنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اِس کے

بعد فوج کے بعض لوگوں کی طرف سے سکندر کو قتل کرنے کی سازشیں ہوتی رہی تھیں لیکن سکندر وقت سے پہلے ہی اُن سازشوں کا پتا چلا کر سازشیوں کے منصوبوں کو ناکام بناتا رہا تھا۔

اسی انداز میں وہ پیش قدمی کرتا اور میدان پر میدان مارتا دریائے بیاس کے کنارے تک آ پہنچا تھا اور یہاں سپاہیوں نے آگے جانے سے اِنکار کر دیا تھا، لیکن سکندر کو اُمّید تھی کہ پہلی نافرمانیوں کی طرح وہ اِس نافرمانی کو بھی ختم کر دے گا۔

اس نے اپنے تمام افسروں، سالاروں کو اپنے پاس بُلایا۔ اگر افسر اور کمانڈر پیش قدمی پر راضی ہو جاتے تو اُن کے ماتحت سپاہیوں کے لیے اُن کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا خواہ اُنہیں ہزار شکایتیں ہوتیں۔

سکندر نے افسروں اور کمانڈروں کے سامنے بڑی جوشیلی تقریر کی۔ اُس شان و شوکت کا احساس دِلایا جو انہیں پچھلی فتوحات کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی اور اِس

فتح کا نقشہ کھینچا جو آگے اُن کا اِنتظار کر رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا:

"یاد رکھو! بہادروں کی محنت اور مشقّت کبھی ختم نہیں ہوتی، یہاں تک کہ خود محنت و مشقّت ختم ہو جاتی ہے۔ کیا تُم آگے بڑھنے سے اِس لیے ڈرتے ہو کہ کوئی اور دُشمن تمہارے مُقابلے پر آ جائے گا؟ کیا تُم اِس لیے ڈرتے ہو کہ اُس کے پاس چھ ہزار ہاتھی ہیں، کیا تُم اِس لیے ڈرتے ہو کہ اُس کے پاس آٹھ ہزار جنگی رَتھ ہیں؟ کیا تُم اِس لیے ڈرتے ہو کہ اُس کے پاس اسّی ہزار گھُڑسوار ہیں؟ اور کیا تُم اِس لیے ڈرتے ہو کہ اُس کے پاس دو لاکھ پیادہ سپاہی ہیں؟ کیا دارا کے پاس بھی اِتنے ہی سپاہی نہیں تھے؟ یقین رکھو کہ اسّی ہزار گھوڑوں اور دو لاکھ سپاہیوں کے باوجود دُشمن تمہارے سامنے نہیں ٹھہر سکے گا کہ اُس میں وہ حوصلہ نہیں ہے، جو تمہارے دِلوں میں اور تمہارے سکندر کے دِل میں ہے۔"

سکندر اتنا کُچھ کہہ کر ذرا رکا، پھر کہنے لگا:

"تم کہتے ہو کہ اِن لڑائیوں کا خاتمہ ہوتا نظر نہیں آتا، لیکن میں کہتا ہوں کہ

بہادروں کے لیے لڑائی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر ہم یہاں سے واپس ہو گئے تو جِن علاقوں کو ہم نے فتح کیا ہے، وہ دوسرے علاقوں کے ساتھ مل کر پھر باغی ہو جائیں گے۔ تُم یہ جاننا چاہتے ہو کہ جنگ کب ختم ہو گی، تو سُنو! یہاں سے کُچھ فاصلے پر گنگا ہے اُس سے ذرا آگے مشرقی سمندر ہے۔ وہاں پہنچ کر یہ ختم ہو جائے گی۔ سمندر کے پاس پہنچ کر ہم بیڑا تعمیر کریں گے اور ہندوستان کے اُوپر سے ہوتے ہوئے مِصر پہنچ جائیں گے اور پھر افریقہ کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہر قل دیوتا کے ستونوں تک جائیں گی۔" سکندر نے پھر اُنہیں اُن کی پِچھلی کامیابیاں یاد دِلاتے ہوئے کہا:

"ذرا خیال تو کرو کہ ہم نے محنت و مشقّت سے کتنی بڑی دُنیا فتح کر لی ہے اور یہ ساری کامیابیاں ہمیں اپنے سپاہیوں کی ہمّت اور حوصلے کی بدولت حاصل ہوئی ہیں۔ وہ تھوڑی سی ہمّت اور دِکھائیں گے، تھوڑا سا حوصلہ اور کریں گے تو ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ ہم نے اِن کامیابیوں کے لیے مِل جُل کر محنت کی ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ تکلیفیں اُٹھاتا رہا ہوں، ہمّت نہ ہارو

اور آگے بڑھو۔ جو جانا چاہتا ہے، بے شک چلا جائے۔ میں کِسی کو اُس کی مرضی کے خلاف ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ لیکن میں دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو میرے ساتھ رہیں گے، وہ اپنے بچّوں کے لیے رشک کا باعث بن جائیں گے۔ یہ سکندر کا وعدہ ہے اور سکندر نے آج تک اپنا کوئی وعدہ نہیں توڑا۔"

اتنا کُچھ کہہ کر سکندر نے چند لمحے خاموشی اختیار کی۔ پھر کہنے لگا:

"میں جو کُچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا۔ اب تم کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟ جسے یہ بات منظور نہیں، وہ صاف صاف بتا دے۔ اپنے دِل کی بات صاف صاف کہہ ڈالے۔"

افسروں اور کمانڈروں پر خاصی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ آخر کوئی نوس نامی کمانڈر اُٹھا اور کہنے لگا:

"اے سکندر! میں اِن افسروں اور کمانڈروں کی طرف سے نہیں، فوج کے عام سپاہیوں کی طرف سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ سپاہیوں کی یہ رائے ہے کہ اُن کی محنت اور مشقّت کا کہیں تو خاتمہ ہونا چاہیے۔ تُم خود دیکھ سکتے ہو کہ آٹھ سال پہلے

جو مقدونوی یا یُونانی ہمارے ساتھ چلے تھے، اُن میں سے صرف چند لوگ رہ گئے ہیں۔ باقی یا تو جنگوں میں مارے گئے یا زخمی ہو کر کام کاج کے قابل نہ رہے یا بیمار پڑ گئے یا پھر اُنہیں اُن کی مرضی کے خلاف نئے آباد کیے جانے والے شہروں میں چھوڑ دیا گیا۔ ذرا اُن سپاہیوں کی حالت تو دیکھو، جو اب تک زندہ ہیں۔ اُن کی حالت خراب ہے اور وہ ہمّت ہار چُکے ہیں۔"

سکندر کو یہ باتیں سُننے کی بالکل توقّع نہ تھی۔ وہ چلّا اُٹھا:

"آخر تُم چاہتے کیا ہو؟"

کوئی نوس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے ماں باپ کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو اپنے بیوی بچّوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ سکندر! اب ہمیں آگے نہ لے جا، اِس لیے کہ ہم وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔ وطن واپس چل اور وطن والوں کو بتا کہ اولمپیاس کا بیٹا کیسے کیسے کارنامے انجام دے کر آیا ہے۔ اور اِس کے بعد

اگر تُو چاہے تو ایک نئی مُہم مشرق یا مغرب، شمال یا جنوب کی طرف شروع کر سکتا ہے اور ہم اِس نئی مُہم میں تیرے ساتھ ہوں گے۔ صرف ہم ہی نہیں، اِس مُہم کے لیے تُجھے اور بہت سے نئے اور تازہ دم مقدونوی اور یونانی مِل جائیں گے جو تیرے لیے اِن تھکے ماندے لوگوں سے زیادہ مفید اور کار آمد ثابت ہوں گے۔"

سکندر کے تمام افسروں نے کوئی نوس کی باتوں کی تائید کی لیکن سکندر غصّے سے بھرا ہوا مجلس سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے روز اُس نے پھر اُن سب کو بُلایا اور کہنے لگا۔ "میں آگے جا رہا ہوں اور صرف اُسی کو ساتھ لے جاؤں گا جو آگے جانا چاہتا ہے، باقی لوگ واپس جا سکتے ہیں اور واپس جا کر اپنے بال بچّوں کو بتا سکتے ہیں کہ ہم اپنے بادشاہ سکندر کو دُشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے ہیں۔"

یہ الفاظ کہہ کر وہ اپنے خیمے میں جا بیٹھا اور تین دِن تک بیٹھا رہا۔ اُس نے کسی کو بھی ملاقات کی اجازت نہ دی۔ اُس کا خیال تھا کہ افسر اور سپاہی آپس میں بات

چیت کر کے اپنا اِرادہ تبدیل کر لیں گے۔ لیکن اُس کا خیال غَلَط نِکلا۔ وہ سکندر کی ناراضگی کے خیال سے پریشان کے ضرور تھے لیکن تین دِن گزر جانے کے باوجود بھی اپنے کے اِرادے پر قائم تھے۔ اُن میں سے ایک بھی آگے نہیں جانا چاہتا تھا۔ سکندر کے ہزار دِلاسوں کے باوجود وہ اُس موت نے مُنہ میں نہیں جانا چاہتے تھے جو دریائے ستلج کے پار اُن کی مُنتظر تھی۔

تین دِن خیمے میں بیٹھے رہنے کے بعد سکندر شام کے وقت باہر آیا۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سپاہ کے اِرادے میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔

یہ بھادوں کے دِن تھے۔ ہوا بند تھی اور حبس نے لوگوں کو بے چین کر رکھا تھا۔ سپاہی ٹولیوں کی صورت میں خیموں کے باہر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اُن سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور پیشانیوں پر فکر اور پریشانی کی لکیریں اُبھری ہوئی تھیں۔ سپاہی آپس میں باتیں کر رہے تھے اور یہ باتیں سکندر کے بارے میں تھیں۔ وہ اِس بات سے پریشان تھے کہ اُن کی نافرمانی کے باعث سکندر ناراض ہو گیا ہے اور غصّے کی حالت میں نہ جانے کیا قدم اُٹھائے۔ مگر سکندر کی

ناراضی کے باوجود اُنہیں دریائے بیاس کے پار جانا کسی قیمت پر بھی قبول نہ تھا۔ سپاہیوں کی ہر ٹولی میں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

مگر جیسے ہی سکندر سپاہیوں کی کسی ٹولی کے قریب پہنچتا وہ ایک دم یُوں خاموش ہو جاتے جیسے سانپ سُونگھ گیا ہو۔

سکندر سپاہیوں کے خیموں کے درمیان یُوں پھِرتا رہا جیسے وہ اُن کا بادشاہ نہ ہو کوئی آوارہ اور بھٹکی ہوئی روح ہو۔ آدھی دُنیا کا بادشاہ بے چارگی اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

دیوتاؤں کی مرضی

ہم تینوں، سارنگ بابا، میں اور اُوشا، دوسرے سپیروں اور جوگیوں کی طرح برابر سکندر کے ساتھ تھے۔ پورس کے ہاں سے روانہ ہو کر ہم نے سیال کوٹ کے راجا کی مہمان کا لُطف بھی اُٹھایا تھا، سانگلا کے کاتھیاؤں کی تباہی کا دردناک منظر بھی دیکھا تھا اور راجا سو بھوتی کے کُتّوں کا تماشا بھی دیکھا تھا۔

ہم سے اگرچہ سکندر کے دوست اور ساتھی کی حیثیت سے اُس کی فوج کے ساتھ سفر کر رہے تھے، لیکن اب تک ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا تھا جس سے ہمیں اپنی اِس حیثیت کا احساس ہوتا۔ یُوں لگتا تھا جیسے سارنگ، انوشا اور اُوشا کر بالکل

بھُول چُکا ہے۔

مگر ایک رات، سپاہیوں کے خیموں کے درمیان ایک آوارہ اور بھٹکی ہوئی فوج کی طرح پھِرتے رہنے کے بعد، سکندر ہمارے خیمے میں چلا آیا۔ اُس کے یُوں اچانک آ جانے سے ہم ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور جلدی سے اُسے سلام کیا۔ سارنگ بابا نے کہا:

”مہاراج! ہمیں بُلوا لیا ہوتا۔“

”اس وقت مہاراج میں نہیں، تُم ہو سارنگ بابا۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے اِنکار کر دیا۔“

سارنگ بابا نے ذرا دیر خاموشی اختیار کی، پھر کہنے لگے۔

”اے سکندر! تُجھے اولمپیاس نے صرف جنم دیا ہے۔ تُجھے آدھی دُنیا کا بادشاہ بنانے والے یہ سپاہی ہیں جو اب تک تیرے ایک اشارے پر اپنی جان دینے کو تیّار رہے ہیں۔ تُجھ پر اِن کا بہت بڑا حق ہے۔“

”سارنگ بابا! میں نے اُنہیں وہ حق دیا ہے جو کبھی کِسی نے نہیں دیا۔ میں نے اُنہیں اپنی دولت میں بھی شریک کیا ہے اور اپنے کارناموں میں بھی۔ میں آگے جانا چاہتا ہوں تو صرف اپنے لیے نہیں، اُن کے لیے بھی۔ اُنہیں میں اِس سے بھی بڑے بڑے کارناموں میں حصّے دار بنانا چاہتا ہوں۔“

سارنگ بابا نے کہا۔ ”اے سکندر! ہر انسان کو دُنیا میں وہی کُچھ ملتا ہے جو اُس کے نصیب میں ہوتا ہے۔ تُو آدھی دُنیا کو فتح کر چُکا ہے لیکن ذرا دیکھ تو سہی کہ تُو نے بہت کُچھ حاصل کیا اور بہت کُچھ تباہ کیا۔ تُو نے شہروں کے شہر اور آبادیوں کی آبادیاں ویران کی ہیں۔ تُو لاشوں کے ڈھیر پر سے گُزرا ہے اور انسانی خون کے سمندر میں سے تیر کر یہاں آیا ہے۔ کیا تُو اسی لیے اپنے وطن سے نکلا تھا؟“

”میں آپ کی بات نہیں سمجھا، سارنگ بابا!“

”اے سکندر! میں نے یہ کہا تھا کہ ہر آدمی کو اُتنا ہی ملتا ہے جو اُس کے نصیب میں ہوتا ہے۔ وہ ہزار کوشش کرے تو اُس سے زیادہ کُچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ تیری

فوج نے اگر تیرا ساتھ دینے سے اِنکار کر دیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا نصیب یہی کُچھ ہے۔ اِس لیے کہ بادشاہ فوج کے ساتھ ہی بادشاہ ہوتا ہے۔ فوج کے بغیر وہ کُچھ نہیں رہتا۔"

سکندر نے کہا۔ "سارنگ بابا! میں جو کُچھ کرنا چاہتا ہوں اُس میں مُجھ سے زیادہ میری فوج کا بھلا ہے۔ فوج میرا ساتھ دے تو ہم دیکھتے ہی دیکھتے گنگا کی وادی سے ہوتے ہوئے مشرقی سمندر تک پہنچ سکتے ہیں۔ دُنیا کی کوئی طاقت سکندر کی فوج کا راستہ نہیں روک سکتی۔"

"اے سکندر! یہ تیری بہت بڑی بھُول ہے۔ کیا تُو نے راجا سوبھوتی کے کُتّوں کو نہیں دیکھا تھا کہ اُنہوں نے کھیل ہی کھیل میں تیرے گھُڑسواروں کا کیا حال کیا تھا؟"

"دیکھا تھا اور بڑے غور سے دیکھا تھا۔" سکندر نے کہا۔ "اور میں اُن کی مہارت پر اب تک حیران ہوں۔"

”کیا تُجھے پورس کے ساتھ لڑائی یاد نہیں؟“ سارنگ بابا بولے۔ ”کیا تُو سانگلا کے کاٹھیوں کو بھُول گیا ہے؟“

”مُجھے سب کُچھ یاد ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”اور تیرے سپاہیوں کو بھی یاد ہے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”اُنہیں دارا کے ساتھ لڑائیوں میں کبھی اِتنا پریشان نہیں ہونا پڑا تھا جتنا وہ اِن دو چھوٹے سے راجاؤں کے ساتھ لڑائیوں میں پریشان ہوئے ہیں۔ اگر وہ آگے جانے سے اِنکار کر رہے تو یہ ایک قدرتی بات ہے۔ یہ بات تُجھے سمجھ لینی چاہیے۔“

”میں جانتا ہوں کہ میرے سپاہی لڑتے لڑتے تھک گئے ہیں۔ اُنہیں اپنے گھروں سے نکلے آٹھ سال ہو چُکے ہیں اور وہ اپنے وطن سے بارہ ہزار میل دُور آ چُکے ہیں لیکن اگر وہ ہمّت سے کام لے کر میرے ساتھ آگے بڑھیں تو پہلے سے کہیں زیادہ عظیم کامیابیاں اُن کے قدم چومیں گی۔“

سارنگ بابا ذرا دیر خاموش رہے اور پھر بولے۔ ”اے سکندر! یہ تیرا خیال ہے

لیکن اِس دُنیا پر تیرے خیال کی نہیں، اَن دیکھی طاقتوں کی مرضی چلتی ہے۔ ہم لاکھ چاہیں، ہوتا وہی ہے جو اَن دیکھی طاقتیں چاہتی ہیں۔ کیا تُجھے یاد نہیں کہ تُو دریائے سندھ کے کنارے ایک نہ دو، پورے تیس دِن پڑا رہا تھا اور دریا پار کرنے سے ہچکچاتا رہا تھا، جب کہ تیرے افسر اُس پر کشتیوں کا پُل بنا بھی چکے تھے۔"

"مُجھے یاد ہے، سارنگ بابا!" سکندر نے کہا۔ "میں نے دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی تھیں۔ مُجھے اُن کی طرف سے نیک شگُون کا انتظار تھا۔ نیک شگُون ملنے کے بعد ہی میں نے دریا پار کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اب مُجھے اِس قسم کے شگُون پر کوئی اعتقاد نہیں رہا۔"

"اے سکندر! تُجھے نہ سہی، تیرے سپاہیوں کو تو ہے۔" سارنگ بابا نے کہا۔

سارنگ بابا کی یہ بات سُن کر سکندر جیسے چونک گیا۔ کہنے لگا۔ "سارنگ بابا! آپ نے مُجھے ایک راہ سمجھا دی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ ہم حیران رہ گئے۔ سارنگ بابا نے میری اور اُوشا کی طرف دیکھا اور پھر مُسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

"تم نے آدھی دُنیا کے بادشاہ کی بے چارگی اور بے بسی دیکھی؟ بیٹے قدرت بڑے بڑے بلوانوں کی طاقت کا پل بھر میں ناس کر دیتی ہے۔ انسان کتنا مُورکھ ہے کہ غُرور میں آ کر اپنے آپ کو دیوتاؤں کی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ انسان انت ہے اور دیوتا دیوتا۔"

سکندر اپنے آپ کو قریب قریب دیوتا ہی سمجھ بیٹھا تھا، لیکن اب اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تو بالکل ایک انسان کی طرح بے بس ہے۔ سارنگ بابا کی باتوں نے اُسے اُس کی بھُول کا احساس دِلا دیا تھا۔

اور اُس نے اپنے خیمے میں جا کر پھر اپنے افسروں کو جمع کیا۔ وہ حیران تھے کہ اِتنی رات گئے نہ جانے وہ کون سا نیا حکم دینا چاہتا ہے! سکندر نے اُنہیں زیادہ انتظار میں نہیں رکھا۔ اُس نے کہا:

"میں نے آگے بڑھنے اور واپسی کا فیصلہ دیوتاؤں کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ کل دریا پار کرنے کے لیے شگُون نکالے جائیں گے۔ اگر شگُون اچھّا ہوا تو ہم آگے بڑھیں گے اور اگر شگُون خلاف نِکلا تو فوج کو واپسی کا حکم دے دیا جائے گا۔" افسر سکندر کے خیمے سے نکلے اور اُنہیں نے اُسی وقت سپاہیوں کو سکندر کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

اب سارا معاملہ دیوتاؤں کی مرضی پر تھا اور دیوتاؤں کی مرضی سکندر اور اُس کے سپاہیوں کے خیال میں صرف مقدونیہ کا وہ بوڑھا کاہن ایرستاندر ہی معلوم کر سکتا تھا جو فوج کے ساتھ تھا۔ دیوتاؤں کی مرضی معلوم کرنے کے لیے جب بھی شگُون نکالنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو ایرستاندر کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔

ایرستاندر یونان بھر میں غیب کی باتیں بتانے والے کاہن کی حیثیت سے مشہور تھا اور اس نے اب تک جتنی پیش گوئیاں کی تھیں، وہ سب کی سب دُرست ثابت ہوئی تھیں۔

اسوس کے میدانِ جنگ میں فارس کے بادشاہ دارا کو شکست دینے کے بعد جب سکندر نے دارا کی سلطنت کے ساحلی شہروں صور اور غزہ کی طرف پیش قدمی کی تو بوڑھا ایرستاندر اُس کی فوج کے ساتھ تھا۔

شہر صور ساحل سے ہٹ کر ایک چھوٹے سے چٹانی جزیرے پر آباد تھا۔ اُس لیے خُشکی کی طرف سے کوئی فوج اُس کا محاصرہ نہیں کر سکتی تھی۔ سکندر سے بہت پہلے بابل کے بادشاہ بخت نصر نے خُشکی کی طرف سے صور کا محاصرہ کیا تھا لیکن پندرہ سال تک محاصرہ جاری رکھنے کے باوجود وہ صور کو فتح نہیں کر سکا تھا اور اُسے جُوں کا تُوں چھوڑ کے واپس چلا گیا تھا۔

لیکن سکندر سکندر تھا، بخت نصر نہیں تھا۔ وہ ناممکن لو مُمکن بنانا جانتا تھا۔ ساحل سے جزیرے کا فاصلہ کوئی نو سو گز تھا۔ ساحل اور جزیرے کے درمیانی حصّے میں پانی اتنا زیادہ نہیں تھا۔ سمندر کی سطح پتھّریلی تھی اور شہر کے قریب پہنچ کر پانی کی گہرائی کوئی چھ گز ہو جاتی تھی۔ سکندر نے ساحل سے جزیرے تک پتھّروں کا راستہ تیّار کرایا اور اس کے ساتھ ہی جہازوں اور کشتیوں پر منجنیقیں لگوا کر اُن

سے بھاری بھاری پتھّر شہر کی فصیل پر پھینکے اور یوں وہ صور جسے بابل کا بادشاہ بخت نصر پندرہ سال کے محاصرے کے بعد بھی فتح نہ کر سکا، اُسے سکندر نے صرف سات ماہ میں فتح کر لیا۔

صور کو فتح کرنے کے بعد سکندر غزہ کی طرف بڑھا اور اُس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ شہر ایک اُونچے ٹیلے پر آباد تھا اور یہ ٹیلا پچھلے دو ہزار سال کے مکانوں کے ملبے کے ڈھیر سے بنا تھا۔ اُس وقت اس شہر کا حاکم شاہ دارا کا ایک وفادار خواجہ سرا باطیس تھا۔ اُس نے شہر کے اندر خوراک اور دوسرا سامانِ رسد بھاری مقدار میں جمع کر لیا تھا۔ اُس نے شہر کی فصیل کو اور مضبوط بنالیا تھا اور اُس کی حفاظت کے لیے کافی فوج جمع کر لی تھی۔

سکندر نے شہر سے باہر، میدان سے، فصیل کے اُوپر کے حصّے تک پتھّروں کا ایک راستہ تیّار کرایا جو میدان کی سطح سے کوئی دو سو ہاتھ بُلند تھا۔ اِس طرح سکندر کی فوج غزہ کی فصیل کے اُوپر کے سِرے تک پہنچ گئی مگر اِس کے باوجود غزہ والے بڑے حوصلے سے مُقابلہ کرتے رہے۔

پھر ایک صُبح مقدونیہ کے بوڑھے کاہن ایرستاندر نے شگُون نکالا:

"سکندر آج شہر فتح کرلے گا، مگر اُسے اپنی زندگی کے بارے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

اسی روز میدان سے فصیل کے بالائی سِرے تک بنے ہوئے ڈھلوان راستے پر دونوں فوجیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ سکندر کی فوج فصیل کی طرف بڑھ رہی تھی اور غزہ کی فوج اُسے پیچھے دھکیلنے اور فصیل سے دُور رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

پھر ایک موقع ایسا آیا کہ غزہ کی فوج سکندر کی فوج کو اس ڈھلوان راستے پر پیچھے دھکیلنے لگی۔ سکندر نے یہ دیکھا تو بے سوچے سمجھے اپنے محافظ دستے کے ساتھ لڑائی میں کُود پڑا۔ اُس کی اِس دلیری نے یونانی فوجیوں میں ایک نئی رُوح پھُونک دی اور وہ غزہ کی فوج کو دھکیل کر فصیل تک لے گئے۔

اس کے ساتھ ہی یونانی منجنیقوں نے پتھّر برسا برسا کر غزہ کی فصیل میں جگہ جگہ

شگاف ڈال دیے۔ سکندر کی فوج شہر میں داخل ہو گئی، لیکن غزہ والوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ فصیل پر، فصیل کے شگافوں میں، گلی کوچوں اور بازاروں میں یونانی فوج کا مُقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ اُن کا ایک ایک فرد مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا۔ صور شہر کی فتح کے وقت آٹھ ہزار شہری مارے گئے تھے اور تیس ہزار گرفتار ہوئے تھے جنھیں غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔

اسی لڑائی کے دوران میں ایک منجنیق سے پتھّر کا گولا سکندر کی ڈھال پر گِرا۔ اس گولے نے سکندر کی ڈھال کے دو ٹکڑے کر دیے اور پھر زرہ بکتر کر توڑتے ہوئے اُس کے کندھے کی ہڈّی توڑ ڈالی۔ صرف یہی نہیں، غزہ پر آخری حلّے کے وقت ایک اور پتھّر اُس کی ٹانگ پر آ کر لگا۔

اور یُوں مقدونیہ کے بوڑھے کاہن ایرستاندر کی بات پوری ہوئی۔ سکندر نے غزہ کو دو مہینے کے محاصرے کے بعد فتح کر لیا تھا لیکن اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر۔ اُس کے بعد ایرستاندر کا کہا سکندر اور سکندر کے سپاہیوں کے لیے پتھّر کی لکیر بن گیا۔

غزہ کی فتح کے بعد باطیس گرفتار ہو کر سکندر کے سامنے پیش ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک خُون میں نہایا ہوا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سکندر باطیس کی بہادری کی داد دیتا لیکن اُس کا کندھے کا زخم ابھی تازہ تھا اور ٹانگ بھی پتھّر کے گولے کا درد ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔ باطیس کر سامنے دیکھ کر اُس کا خُون کھول اُٹھا۔ اُس نے باطیس کے دونوں پاؤں کٹوا دیے، اُس کے زخموں سے تسمے گُزار کر اُسے ایک رَتھ کے پیچھے باندھا اور پھر اُس رَتھ کو اس وقت تک دوڑاتا رہا جب تک باطیس کی جان نہیں نکل گئی۔

اور پھر جب اربیلہ کے مقام پر سکندر اور دارا کے درمیان فیصلہ کُن جنگ ہوئی تو لڑائی سے پہلے سکندر نے افسروں کو ہدایات دینے کے بعد ایرستاندر کو بُلایا۔ اُس نے دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دینے کے بعد ایرستاندر سے شگُون نکلوایا اور پھر بڑے آرام سے سو گیا، اور دِن چڑھے تک سوتا رہا۔ افسر اور سپاہی ساری رات خوف کے مارے جاگتے رہے تھے، کیوں کہ انہیں کُچھ دُور مشعلوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ شہنشاہ دارا اُن مشعلوں کی روشنی میں اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا

اور یونانی سپاہیوں کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں دارا کی فوج رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حملہ نہ کر دے۔ اِسی خوف سے اُنہوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔

جب سورج کی کرنیں مشرقی سمت سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر نمودار ہوئیں تو سکندر اُس وقت بھی سویا ہوا تھا۔ اُس کے ایک افسر پارمینیو نے اُسے جا کر جگایا اور اُس کے یُوں بے فکر ہو کر سونے پر حیرانی ظاہر کی۔

سکندر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "فکر کا وقت صرف اُس وقت تھا جب تک ہم اپنے دُشمن کو میدانِ جنگ میں نہیں لے آئے تھے۔ میں نے فوجوں کی ترتیب اور لڑائی کے بارے میں ہدایات پہلے ہی دے دی تھیں۔ ایرستاندر نے شگُون نکال کر مُجھے اطمینان دِلا دیا تھا۔ پھر میں بے فکر ہو کر کیوں نہ سوتا؟"

اور اِسی ایرستاندر کے اطمینان نہ دِلانے کی بنا پر سکندر ایک نہ دو، پورے تیس دِن دریائے سندھ کے کنارے ڈیرے ڈالے پڑا رہا تھا، حالانکہ اُس کے افسر دریا

پر کشتیوں کا پُل بنا چکے تھے اور موسم یا کسی اور طرح کی رکاوٹ بھی سامنے نہیں تھی۔ اُس نے تین ہزار بیل اور دس ہزار بھیڑیں دیوتاؤں کے نام پر قُربان کی تھیں، تب کہیں جا کر ایرستاندر نے دریا پار کرنے کے لیے نیک شگُون نِکالا تھا۔

سندھ کے بعد سکندر نے اور دریا بھی پار کیے تھے۔ وہ موسلا دھار بارش میں اپنے سترہ ہزار سواروں اور سپاہیوں کے ساتھ اٹھارہ میل کا سفر کرنے کے بعد راتوں رات جہلم کے دریا کو عبور کر کے پورس کے مُقابلے پر آیا تھا۔ دریائے جہلم کے بعد اُس نے دریائے چناب کو پار کیا تھا اور چناب کے بعد دریائے راوی کو عبُور کر کے اب بیاس کے کناروں تک آ پہنچا تھا۔ مگر یہ دریا پار کرتے ہوئے اُس نے نہ دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی تھیں اور نہ ایرستاندر کو نیک شگُون نکالنے کے لیے کہا تھا۔ اس لیے کہ اب وہ خود اپنے آپ کو دیوتا سمجھنے لگا تھا اور دیوتا کو مقدونیہ کے بوڑھے کاہن کے مشورے یا نیک شگُون کی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن اب سپاہیوں کی بغاوت نے اُسے احساس دِلا دیا تھا کہ وہ دیوتا نہیں، ایک عام انسان ہے۔ آدھی دُنیا کا بادشاہ ہونے کے باوجود وہ سپاہیوں کے اِنکار کے سامنے

بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اور آخر کار اُس نے پھر مقدونیہ کے بُوڑھے کاہن ایرستاندر سے کہا تھا کہ وہ دریا پار کرنے کے لیے شگُون نکالے۔

چنانچہ یُونانی رسم کے مطابق دیوتا زیوس کے نام پر ایک بھیڑ قربان کی گئی اور ایرستاندر نے اُس کا جگر نکال کر دیکھا۔ کُچھ دیر تک وہ بھیڑ کے جِگر کو غور سے دیکھتا رہا۔ جیسے اُس میں نظر آنے والی غیبی نشانیوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

خاصی دیر کے غور و فِکر کے بعد اُس نے سر اُٹھایا اور سکندر سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے سکندر! اِس دریا کو عبُور کیا گیا تو بہت بڑی آفت نازل ہو گی!"

سکندر کے دِل پر جیسے بجلی گِر پڑی۔ دیوتاؤں نے اُس کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ مگر اُس کے سپاہی خوش تھے۔ وہ چھلانگیں لگاتے اور خُوشی کے نعرے لگاتے سکندر کے خیمے کے گرد جمع ہو گئے اور سکندر کے لیے خیر اور برکت کی دُعائیں کرنے لگے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اب اُن کے جو بھی قدم اُٹھیں گئے وہ واپس

وطن کی طرف اُٹھیں گے۔

☆☆☆☆☆

سکندر کی سات دریاؤں کی سر زمین سے واپسی۔ دریائے جہلم اور چناب کے سنگم پر ملّہی، سیوی اور یادیو قبیلوں کے ساتھ خوفناک جنگیں۔ سکندر کے جانے کے بعد سات دریاؤں کی سر زمین پر کیا بیتی؟ چندر گُپت نے راج پاٹ کیسے حاصل کیا؟ سارنگ بابا انوشا اور اُوشا چندر گُپت کے ساتھ ٹیکسلا گئے تو وہاں راجا امبھی اور اُس کے بیٹے کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا؟ سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا چندر گُپت کی خاطر ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر کی طرف چلے تو انہوں نے کیا کُچھ دیکھا۔۔۔

یہ سب کچھ جاننے کے لیے انوشا کی آپ بیتی کا چوتھا حصّہ انوشا اور چندر گُپت موریہ پڑھیے۔

ختم شد